انیس امام

حرفِ خودی

شعری مجموعہ

مرتبہ

پروفیسر ادیب حسن ادیب

مرتب ——— پروفیسر ادیب حسن ادیب

ناشر ——— نصرت پبلشرز ۔ لکھنؤ

کتابت ——— قمر نظامی، معروف گنج گیا

طباعت ——— تاج پریس باری روڈ گیا

تعداد اشاعت ——— ایک ہزار

قیمت

عام ایڈیشن : دس روپے ۱۰

لائبریری ایڈیشن : پندرہ روپے ۱۵

پروفیسر سیّد احتشام حسین مرحوم

کے نام

جن کی لازوال محبّت "حرف خودی"

کی اشاعت کا سبب بنی۔

فہرست مندرجات

نام ــــــــــــــــــــــ محمد انیس امام

جائے پیدائش ــــــــــــــــــــــ عالم گنج، پٹنہ ۷

تاریخ پیدائش ــــــــــــــــــــــ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۴ء

تعلیم ــ
بی، اے آنرز (اردو) ۱۹۵۱ء پٹنہ یونیورسٹی
ام، اے (اردو) ۱۹۵۳ء پٹنہ یونیورسٹی
ام، اے (فارسی) ۱۹۵۸ء پٹنہ یونیورسٹی

پیشہ ــــــــــــــــــــــ درس وتدریس

پتہ ــــــــــ شعبۂ اردو، مہاراجہ کالج، آرہ (بہار)

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

'حرف خودی' کی اشاعت کا اعلان' ایک عرصہ ہوا قارئین نے اخبار میں دیکھا ہوگا۔ اُس وقت سے اِس وقت تک نہ جانے کتنے مجموعہ ہائے کلام شعرائے اُردو کے شائع ہوئے۔ لیکن انیس امام کا 'حرف خودی' منظر عام پر نہ آسکا۔ اسے تساہل کہئے یا شاعرانہ بے نیازی، بہرحال مجھے خوشی ہے کہ مجھے حرف خودی کی اشاعت پہ انیس امام صاحب کی مشروط رضامندی حاصل ہوگئی۔ شرط یہ تھی کہ کتابت وطباعت کی دیکھ بھال نیز ترتیب و تزئین کی ذمہ داری میں قبول کرلوں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انیس امام صاحب پہ اسے چھوڑ دیا جاتا تو مجموعہ کلام شاید کبھی نہ چھپ سکتا۔ آپ اسی سے اندازہ لگائیے کہ تقریباً ربع صدی کی کاوش جسے کم ازکم دو تین کتابوں کی شکل میں شائع ہونا چاہئے تھا صرف ایک منتخب مجموعہ کی شکل میں آپ کے سامنے ہے ——— قطع و برید کلام کے متعلق اُردو میں حرف غالب ہی کا نام اب تک مشہور تھا۔ نہایت ادب کے ساتھ میں انیس امام صاحب کا نام بھی اس فہرست میں شامل کرنے کی جسارت کروں گا۔

مجموعہ کلام آپ کے سامنے ہے۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ کتاب خوبصورت ہو اس میں تازہ ترین تخلیقات بھی شامل کرلی جائیں تاکہ کلام کے آئینے میں انیس امام کی مجموعی شخصیت کو دیکھا جاسکے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ انیس امام ایک قادر الکلام شاعر ہیں، جذبات کی صداقت فکر کی بلندی اور اسلوب کی شیرینی ان کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں، ان کے علاوہ بہت کچھ ہے جس کی تفصیل کی گنجائش فی الوقت نہیں۔

اس مجموعہ میں چند سانیٹ بھی ہیں، کچھ رباعیاں بھی۔ کچھ منتخب غزلیں اور

نظمیں ہیں۔ اس میں تقریباً ساری چیزیں قابل قدر ہیں۔ کچھ چیزیں تو لافانی اور بے مثل ہیں۔ ع

مینائے رقومات ہنر چاہئے اس کو
سودا ہے جواہر کا نظر چاہئے اس کو

میں کلام پر کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا، کیوں کہ میری حیثیت محض ایک مرتب کی ہے۔ وقت خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ اردو شاعری کی تاریخ میں 'حرف خودی' کا کیا مقام ہے۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ جدیدیت کے سیلاب میں بھی انیس امام کے اشعار ایک اٹل روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں صحت مند ترقی پسندی بھی ہے اور صالح جدیدیت بھی۔

کلام کی انفرادیت کے سوا اس کتاب میں نہ آپ کو تقریظ ملے گی، نہ تعارف، نہ رسمی تعریف و توصیف۔ خود شاعر نے اپنے مقدمے میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اسے کسی بے جا تعریف کی ضرورت نہیں، وہ صرف انصاف چاہتا ہے۔ بہت کم شاعروں نے اپنے نقطۂ نظر کو اس جرأت اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے ___ مسودہ جس شکل میں میرے سامنے آیا اس میں انتخاب ثانی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، میں نے اپنے خصوصی اختیار سے کام لے کر کچھ تازہ ترین تخلیقات بھی اس میں شامل کر دی ہیں جنھیں قارئین یقیناً پسند کریں گے ___ انیس امام صاحب کی دلی خواہش تھی کہ پروفیسر احتشام حسین صاحب بھی ان کے مجموعے کے متعلق اپنی گراں قدر رائے کا اظہار فرماتے چنانچہ انہوں نے وعدہ بھی فرمایا تھا مگر افسوس کہ اس کی اشاعت سے قبل ہی علم و دانش کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، بہر حال انہوں نے انیس صاحب کے خط کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ حرف بہ حرف شامل اشاعت ہے ___ میں نصرت پبلشرز لکھنؤ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ عابد سہیل صاحب خاص طور سے مبارک باد کے مستحق ہیں ___ ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔

ادیب حسن ادیب[*]

---

[*] لکچرر شعبۂ انگریزی اس وی پی کالج بھبوا (رہتاس)

پیش لفظ

"حرفِ خودی" میرا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ آخری بھی ہو سکتا ہے۔۔۔
اس لئے نہیں کہ مَیں اپنی زندگی سے خدانخواستہ مایوس ہوں بلکہ اس لئے کہ
بقول پروفیسر احتشام حسین صاحب:
"شعر و شاعری سے قارئین کی دل چسپی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے"
یہ بات صرف اُردو کے ساتھ نہیں بلکہ عالمگیر سطح پہ ایسا دیکھا جا رہا ہے۔
جو بھی ہو میں اپنی ربع صدی کی کاوشوں کا حقیر سا ثمرہ دوستوں کے
اصرار پہ قارئین کے حوالہ کر دینا چاہتا ہوں کیوں کہ اب یہ صرف میری چیز نہیں
رہ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ قارئین کی نگاہ میرے کلام تک پہنچے میں فن اور
دائرہ فن سے متعلق اپنے خیالات بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ
میرے کلام کے مطالعہ میں قارئین کو کسی دُشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ تو
میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا نقطۂ نظر کہاں تک صحیح ہے لیکن اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا
کہ نقطۂ نظر کے فرق سے الفاظ کے معانی بدل جاتے ہیں۔ رومین رولاں نے
کسی جگہ لکھا ہے کہ:
"دُنیا کو جھوٹ کی خوراک زیادہ اور سچ کی خوراک کم ملتی ہے اسی لئے

لوگ سچی باتوں پر زیادہ متحیّر ہوتے ہیں۔"

ممکن ہے میرے مجموعۂ کلام پر بھی لوگ کچھ اسی قسم کے تحیّر کا اظہار کریں اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی کے اُن تلخ تجربات کو شعر کا جامہ عطا کرنے کی کوشش کی ہے جن میں مجھے سچائی نظر آئی۔ سچائی کا معیار میرے نزدیک یہ ہے کہ ذات میں کائنات کا پَرتو دکھائی دے۔ یوں تو نجی تجربات بھی سچائی کے ہی دائرے میں آتے ہیں لیکن انہیں میں عظیم صداقت نہیں تصوّر کرتا۔

تمام اصنافِ ادب میں ایک شاعری ہی کو میں نے کیوں اپنایا؟ اس کا صرف ایک جواب میرے پاس ہے یعنی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ شاعری میرے نزدیک کسی تفریح کا سامان نہیں۔ لطیف جمالیاتی حِس کی تسکین تفریح سے بلند تر ایک چیز ہے۔ سائنس نے تفریح کے اتنے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں کہ شاعری اُن کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ میں شاعری کو تزئینِ حیات کا بہترین ذریعہ تصوّر کرتا ہوں اور تزئینِ حیات اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک حیات کی خامیوں پر نگاہ نہ ہو۔ حیات کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی فرد اور سماج کے درمیان کسی صحت مند رشتے کے بغیر ممکن نہیں۔ میں اِس صحت مند رشتے کی تلاش میں بھی سرگرداں رہا ہوں اور حیات کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی اُجاگر کرتا رہا ہوں۔ تکمیلیت (PERFECTION) ایک تمنّائی چیز ہے۔ فن کار جس قدر اس کے قریب ہوگا فن اُسی قدر کامیاب ہوگا۔ میں اس بات کا قطعی مدعی نہیں ہوں کہ میرا فن کامیاب ہے۔ یہ ناقدین کی ذمہ داری ہے۔ میں نے اس بات کی کوشش ضرور کی ہے کہ فن اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود موجودہ عوام کی

فہم سے زیادہ دُور نہ ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عوام کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کی ذمہ داری فنکار پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ میں مستقبل سے مایوس نہیں شرط صرف یہ ہے کہ حال کو صحیح راہ پہ لگانے کی کوشش کی جائے۔

اس دنیا میں کوئی چیز بے مقصد نہیں یہاں تک کہ ذات کا اظہار بھی مقصد سے عاری نہیں۔ لیکن ذات کا اظہار اُس وقت تک قابل اعتنا نہیں ہو سکتا، جب تک سماج اُس پہ مہرِ تصدیق ثبت نہ کر دے کیونکہ فرد کا نجی تجربہ فریب محض اور گمراہ کُن بھی ہو سکتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں فرانس کے مشہور مفکر مونٹین (MONTAIGNE) نے اپنے مضمون "OF GIVING THE LIE" میں ایک جگہ لکھا ہے:

"BUT WHOM SHALL WE BELIEVE SPEAKING OF HIMSELF IN THIS CORRUPTED AGE? SINCE THERE ARE FEW OR NONE WHOM WE MAY BELIEVE SPEAKING OF OTHERS WHERE THERE IS LESS INTEREST TO LIE."

[مگر اس مذموم دَور میں ہم کس پہ اعتبار کریں گے جو اپنے ہی متعلق کہہ رہا ہو جب کہ ایسے لوگ تھوڑے یا کوئی نہیں جن پہ ہم اعتبار کریں جو دوسروں کے متعلق کہہ رہے ہوں جہاں دروغ گوئی کی دلچسپی نسبتاً کم ہے۔]

میں سمجھتا ہوں کہ مونٹین کا یہ خیال آج کے دور پہ زیادہ صادق آتا ہے۔ موجودہ دَور میں فرد کی اہمیت پہ ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ شاید

مارکسزم کا ردِّ عمل ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ فرد اور سماج کے درمیان گہرے روابط کی ضرورت جس شدت سے آج محسوس کی جا رہی ہے کبھی محسوس نہیں کی گئی۔ تخصیص پسندی کے اس دَور میں ہر فرد ایک دوسرے کا رہینِ منّت ہے۔ لہٰذا ذات پرستی فرادیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ روح عصر یہ نہیں بلکہ وہ خواہش اور وہ تمنّا ہے جو بہتر، اور محفوظ زندگی کے لئے بے تاب ہے۔ فرد کا وجود اجتماعی زندگی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ وجودیت کے سلسلے میں کیر کے گارڈ، نطشے، جاسپرز، مارسل اور ہیڈگر کے نام شدّت سے لئے جا رہے ہیں لیکن دَورِ جدید میں وجودیت کے سب سے بڑے علم بردار سارترے نے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ وجودیت، اشتراکیت سے علیحٰدہ کوئی فلسفہ نہیں بلکہ یہ مارکسزم میں فرد سے متعلق پیدا شدہ خلا کو پُر کرتی ہے سارترے کے اس بیان نے سُرنگوں کی طرف کھُلنے والے بہت سارے دریچوں کو بند کر دیا ہے۔

کوئی اہم فن کار ایسا نہیں جس کا کوئی مخصوص زاویۂ نگاہ نہ ہو میں اسی کو COMMITMENT تصور کرتا ہوں۔ فن کار کا یہ فیصلہ کہ وہ مطلقاً آزاد ہے اور کسی نظرئیے کی پابندی کو قبول نہیں کرے گا خود ایک خطرناک قسم کا COMMITMENT ہے اس لئے کہ بے سمتی فرد کو گمراہ کرنے کے سوا اُسے کچھ نہیں دے سکتی COMMITMENT کو نظریات تک محدود رکھنا بھی حماقت ہے۔ داخلی جذبات و کیفیات کا اظہار بھی اس میں شامل ہے کیونکہ زاویۂ نگاہ کے فرق کے ساتھ فن کاروں کے ردّ عمل میں بھی فرق آ جائے گا باوجودیکہ خارجی حقیقت ایک ہو۔ کسی نظریہ کی پابندی کو قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آنکھیں بند کر لی جائیں اور دل و دماغ کو ان کی

ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ فن کار کی آزادی کا راز دراصل اس کی بصیرت، داخلی کیفیت کے ایماندارانہ اظہار، بلندیٔ افکار اور اسلوبِ بیان میں مضمر ہے۔

فن، قدروں کی تشکیل کرتا ہے۔ قدروں کی کچھ بنیادیں ہیں۔ بنیاد عموماً مادی ہوتی ہے البتہ اس کے اوپری ڈھانچے بدلتے رہتے ہیں۔ نئے ڈھانچے کی تلاش پرانے ڈھانچے کی تخریب کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتی ہے۔ پرانے ڈھانچے کو مسمار کرنے کا خیال بھی کسی نئے ڈھانچے کے تصور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ تصوّر اور حقیقت کی درمیانی منزل بڑی جانگسل ہوتی ہے۔ آج ہم اسی عبوری دَور سے گذر رہے ہیں ہمارے یہاں جتنی بھی قدریں ہیں تقریباً سب کی سب یا جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہیں یا سرمایہ دارانہ نظام کی دَین۔ مذہب نے ان قدروں میں یا توازن پیدا کرنے کی کوشش کی یا انہیں استحکام بخشا۔ اخلاقی قدروں کی تشکیل میں بلاشبہ مذہب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مذہب بھی مفاد پرستوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا۔ مذہب میں خوف و محبت کے عناصر اخلاقی قدروں کی تشکیل میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایٹمی توانائی کے اس دَور میں دنیا کی تباہی کا خوف نہ ہوتا تو اب تک کئی عالمگیر ایٹمی جنگ ہو چکی ہوتی اور دنیا کا کہیں پتہ بھی نہ ہوتا۔ تباہی کے خوف میں محبّت کا عُنصر بھی شامل سمجھنا چاہئے۔

وہ قدریں جو جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہیں اُن کے تحفّظ کا خیال ظاہر ہے اس طبقہ کو سب سے زیادہ ہوگا جو ان دو نظاموں سے سب سے زیادہ فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ قدریں جب اپنی توانائی کھو دیتی ہیں اور مفاد پرست طبقہ کے ہاتھوں میں عوام کے استیصال کا ذریعہ بن جاتی ہیں تو فطری طور پر ان قدروں سے

بیزاری کا جذبہ سب سے پہلے عوام میں پیدا ہوتا ہے ۔ نئی قدروں کا خمیر دراصل عوام کے درمیان تیار ہوتا ہے ۔ دانشور طبقہ محض ان قدروں کی ترتیب و تزئین ، اور تراش خراش کا ذمہ دار ہوتا ہے ۔ لہٰذا میرے خیال میں نئی قدروں کی تلاش میں فن کار کو عوام کے قریب جانا ہوگا ۔

عبوری دور میں ادبی قدریں بھی شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہیں ۔ لیکن جدید وہی ہے جو فرد اور سماج کے درمیان نئے رشتے کی تلاش اور نئی قدروں کی پہچان سے وابستہ ہے ۔ محض لب و لہجہ کا اچھوتا ہونا کافی نہیں ۔ بعض حضرات حال سے بغاوت کو ہی جدید سمجھ رہے ہیں خواہ وہ پیچھے کی طرف ہی کیوں نہ لوٹ رہے ہوں ۔ تبدیلی ارتقار کا ایک عمل ہے ۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ہمیشہ جاری رہے گی ۔

مادّی ترقی اور فطرت پر بڑھتے ہوئے انسانی تسلّط کے سبب اخلاقی قدروں میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ۔ خلار کی تسخیر نے بظاہر انفرادی و معاشرتی زندگی کی رونق ہم سے چھین لی ہے ۔ ایسا اس لئے محسوس ہو رہا ہے کہ سماجی نابرابری ، ناانصافیوں کو جنم دے رہی ہے ۔ دولت چند مٹھیوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے ۔ اقتصادی بدحالی ، سامراجی طلسم کے اثر سے مایوسی و بیزاری کو جنم دے رہی ہے ۔ قومیت ، تنگ نظری کا شکار ہو چکی ہے ۔ وسعتِ قلب و نظر مفاد پرستی کے باعث سمٹتی جا رہی ہے ۔ جد و جہد کا دائرہ محدود ہونے لگا ہے ۔ فن کار کی ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان عوامل سے بے نیاز نہ ہو بلکہ ان کے خلاف اپنی جد و جہد جاری رکھے ۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ فن مقصود بالذات نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ ہے ۔ آج ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ عقل و دل کے درمیان ہم آہنگی پیدا

کی جائے تاکہ حسن فرزانوں کی دست درازی سے محفوظ رہ سکے۔ فن کا کوئی مخصوص موضوع نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موضوع کے انتخاب سے بھی فن کار کی شخصیت مترشح ہوتی ہے۔ انتشار، مایوسی، المناکی، تنہائی، بوالہوسی جیسے موضوعات بھی فن کے دائرے سے خارج نہیں لیکن اچھے یا بُرے کا انحصار ان کی پیش کش پہ ہے۔ اگر ان موضوعات کی پیش کش زندگی کے حسن کو مسخ کرتی ہے تو قابل گرفت ہے ورنہ عین حسن۔ خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی نے شاعری کو مرصع سازی قرار دیا تھا۔ بات اس سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ فن صرف مرصّع سازی نہیں حیات افروزی بھی ہے۔

سیاست اس دور میں زندگی کے تقریبًا تمام شعبوں پر حاوی نظر آتی ہے۔ غیر صحت مند سیاست گویا وقت کا ایمان بن گئی ہے۔ فطری طور پر آج کا ادیب بھی اس سے متاثر ہے۔ ایک سچّا فن کار حالات سے چشم پوشی کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن فراریت فن کی قبا پہن لینے کے باوجود قاری کو حالات کی سنگینی کی طرف متوجہ کرنے سے معذور ہو تو نہایت خطرناک ہے۔ بڑا فن کار دنیا کے اہم مسائل سے چشم پوشی کر ہی نہیں سکتا۔ سارترے کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے اپنے مہمان سے محض اس وجہ سے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا کہ سارترے کے سوال پہ اُس نے ویت نام کے مسئلے سے اپنی عدم دل چسپی کا اظہار کیا تھا۔ ادبی مسائل بھی زندگی سے الگ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ادب کو ہئیتی تجربوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ تجربات فن کے امکانات کو وسیع کرتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر تجربہ فن کار کو صحیح سمت میں لے جائے۔ یہ تو فن کار کی صلاحیت اور اس کے صحت مند رجحان پہ منحصر ہے کہ وہ تجربات کو صحیح سمت عطا کرے

جدّت، صحت مند روایت کے بطن سے ہی جنم لیتی ہے۔ روایت سے مکمل انحراف ممکن نہیں۔

ترسیل کا مسئلہ فن کار اور قاری کا باہمی مسئلہ ہے۔ لیکن ذمہ داری فن کار پہ زیادہ عائد ہوتی ہے، قاری پہ کم۔ اچھے قاری کا پیدا کرنا فن کار کا کام ہے۔ فن کار جب تک اچھے سماج کی تشکیل نہیں کرتا اچھے قاری کی توقع بھی نہیں کر سکتا۔ آصف الدولہ کی وہ بات جو اس نے میر تقی میر کو کہی تھی، ترسیل کے سلسلے میں بہت معنی خیز ہے یعنی:

"اچھا شعر خود اپنی طرف متوجہ کرے گا"۔۔۔۔۔۔

یہ بات آج بھی صحیح ہے۔

اِدھر ہندی شاعری میں اُردو کے مقابلے میں زیادہ تجربات ہوئے ہیں۔۔۔ رجحانات بھی تیزی سے بدلتے رہے ہیں۔ ٹھہراؤ کوئی پندرہ بیس سال سے پیدا نہیں ہوا جس کے نتیجے میں کوئی وقیع چیز سامنے نہ آسکی۔ اُردو میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلیوں کے رونما نہ ہونے کے سبب کسی قدر ٹھہراؤ پیدا ہو گیا اور اسی لئے کچھ اچھی تخلیقات بھی سامنے آگئیں۔ اس تقابلی مطالعہ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ زمانے کی رفتار فن کی گرفت میں ذرا دیر سے آتی ہے۔ کم ہی فن کار ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کے ہم رکاب نظر آتے ہیں۔

ان گزارشات کے آئینے میں میرا کلام ناقص بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے کچھ زیادہ غم نہ ہوگا اس لئے کہ تکمیلِ فن کے بہانے ہی سہی میری جدوجہد جاری رہے گی۔ جدوجہد جو میری زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔

میری شاعری کا آغاز ۴۸ - ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ شوق نیموی کے اثر سے

والدِ محترم (بفضلہ والدین اب بھی سلامت ہیں) بھی عالمِ نوجوانی میں شعر و شاعری کی طرف راغب تھے لیکن یہ سلسلہ دراز نہ ہو سکا اس لئے کہ والدِ محترم کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد میرے دادا جان کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ساری ذمہ داریاں والد پہ آن پڑیں۔ میری نانیہال نیمی (سالار پور) ہے۔ مولانا ظہیر احسن شوق اسی نیمی کے رہنے والے تھے۔ شوق نیموی کی شہرت معرکۂ جلال و شوق کے بعد پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ والدِ محترم کی شادی کے بعد شوق نیموی سے راہ و رسم کا قائم ہونا فطری تھا اسی زمانے میں انہیں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ لیکن پڑھے لکھے سپاہی کی حیثیت سے جب انہوں نے ملازمت اختیار کی تو شاعری دور سے ہی سلام کر کے رخصت ہو گئی شاعری کی شُد بُد کے لئے میں حضرت شمس عظیم آبادی مرحوم کا رہینِ منّت ہوں۔ تین چار تخلیقات نظم و غزل پہ مرحوم نے اصلاح دی۔ ایک نظم کالج کی طالب علمی کے زمانے میں علامہ جمیل مظہری کو دکھائی۔ آپ نے دو مصرعوں کا اضافہ کر دیا ؎

رات سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی، گھبرائی ہوئی
بھاگی جاتی ہے کہیں اپنا اندھیرا لے کر

ان دو مصرعوں سے نظم واقعی جاندار ہو گئی لیکن مانگے کے اُجالے سے میری تشفّی نہ ہو سکی ایک سہرا انجم ندوی مرحوم کو بھی دکھایا اس کے بعد شاعری کی راہ پہ آزادانہ چل پڑا۔ مشاعروں میں علامہ زار عظیم آبادی مرحوم کی مجھ پہ خاص نگاہ رہی باوجودیکہ میں نے کسی نظم یا غزل پہ اُن سے کوئی اصلاح نہیں لی۔ 'زار' فنِ عروض و بلاغت پہ قدرتِ کاملہ رکھتے تھے۔

میرے حالاتِ زندگی وہی ہیں جو ایک متوسط گھرانے کے کسی فرد کے ہو سکتے ہیں

مجھ میں کوئی خاص بات نہیں۔ بات کچھ ہے تو صرف اتنی کہ اندھیرے سے آج تک مفاہمت نہیں کی۔ سمٹ سا گیا ہوں ———— لیکن ضمیر فروشی کے تصوّر سے ہی کانپ اُٹھتا ہوں۔ مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ "حرفِ خودی" ایک ناپسندیدہ سا نام رہ گیا تھا جسے میں نے اپنا لیا۔ کتاب اچھی نظر آئے تو اپنا حُسنِ نظر سمجھئے، بُری معلوم ہو تو مجھے بھی یاد کر لیجئے۔

آخر میں مَیں اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی محبّت میرا سرمایۂ افتخار ہے۔ ان میں میرے بزرگ، میرے اساتذہ، احباب اور شاگردانِ عزیز سبھی شامل ہیں۔ ناموں کی فہرست طویل ہو جائے گی پھر اندیشہ یہ بھی ہے کہ کہیں کوئی چھوٹ گیا تو خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہو گی نہیں بھی چھوٹا تو یہ الزام کون اپنے سر لے کہ میں نے اونچی بیساکھیوں کے سہارے بلندی پہ پہنچنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس فہرست میں کچھ بڑے لوگوں کے نام بھی آئیں گے۔

میں نے ہر تخلیق کے اختتام پہ سنہ تخلیق درج کر دیا ہے۔ لوگوں نے ضرورت سمجھی تو فنّی ارتقا کی تلاش میں انہیں کچھ زیادہ پریشانی نہ ہو گی۔

اسرار المحے

۱۸ر جولائی ۱۹۷۲ء

شعبۂ اُردو

مہاراجہ کالج۔ آرہ (بہار)

نظمیں

غمِ دَوراں کی صَلیب

سنگ تا شیشۂ دل
شیشۂ دل تا بہ دیارِ انصاف
جوئے خوں بہتی ہے آشفتہ سری کے صدقے،
شاخ در شاخ
چمن تا بہ چمن
شعلۂ غم آویزاں'
پیکرِ خاکی ہے یا زیچۂ آسیبِ جہاں
آدمی!
جھول گیا شاخ صنوبر سے لگا کر پھندا
کون ہے اب جو اُٹھائے غمِ دوراں کی صلیب؟
کم سے کم میں تو نہیں!
میں تو نہیں!!
میں تو نہیں!!!

۱۹۶۸ء

نیا موڑ

نامرادی کا احساس
رگ رگ میں کانٹے چبھوتا رہا'
عود کر آئیں اندر کی ویرانیاں
ہڈیاں سوزِ غم سے تڑخنے لگیں
میں سُلگتا گیا
رات چڑھتی گئی
اور اچانک پھر اک بار ایسا ہوا
اپنے شانوں پہ لاشہ اُٹھائے ہوئے

اپنی تقدیر کا
راستے میں صلیبوں سے ٹکرا گیا
تب یہ احساس مجھ کو ہوا دفعتاً
میں کہاں سے چلا تھا کہاں آ گیا،
اک نیا راستہ
دُور تک میں نے دیکھا
کہ جاتا ہے تیرِ نظر کی طرح
آرزوئے دلِ معتبر کی طرح
سعئ پیہم پئے رہگزر ہی تو ہے
زندگی
جستجوئے سحر ہی تو ہے

۱۹۶۹ء

اے ہم نشیں!

صبحِ ازل، شامِ ابد، اک نقطۂ موہوم پر ملنے کو دونوں مضطرب
روحوں کا اک لمبا سفر، جسموں کے سو نام و نشاں، یہ منقلب وہ منقلب

اک سلسلہ در سلسلہ لمحے تقاطرِ وقت کا، گھڑیاں توازن کی امیں
شام و سحر کی داستاں، نقشِ کفِ پائے زماں، ہر سینۂ ارضِ حسیں

گھٹتے ہوئے سے فاصلے، بڑھتی ہوئی سی وسعتیں اندر خلا باہر خلا
ہر دل پہ مہرِ مصلحت، ہر گام پر سو مرحلے، ہر آدمی اُلجھا ہوا

جسموں کے آتش دان میں، روحیں سمٹ کر ہو گئیں گہ نرم دل گہ سخت دل
تقدیر، نامِ بے بسی، تدبیر، سعیٔ آدمی، گہ یہ خجل گہ وہ خجل

عقلِ رسا دُور راز و فا، دل بے نیازِ خوب و زشت، آشفتہ سر آشفتہ سر
سامانِ تسخیرِ خلاء، تدبیرِ تخلیقِ خدا، منجملہ تصلیبِ بشر

چُپ بیٹھ جانا بھی مگر مہلک ہے انساں کے لئے، اک مسئلہ ہے کیا کرے
ہر لمحہ گویا تبر ہے، ہر گام پر زنجیر ہے، الزام بھی کس پر دھرے

زہراب تو رگ رگ میں ہے، اب جراءتِ سُقراط کی تجدید بھی بے سود ہے
شدّاد تو ہیں ہم سبھی، جنّت کی بھی لالچ نہیں اب زندگی مقصود ہے

افشائے رازِ کن فکاں اے ہم نشیں اے ہم نشیں!
جب تک وصالِ عقل و دل ہوتا نہیں ممکن نہیں!!

۱۹۶۷ء

قحط

زمیں سونا اُگلتی تھی
فلک سے مَن برستا تھا
لٹیرے رشک کرتے تھے کہ دولت کم نہیں ہوتی
مگر گھن لگ گیا میری زمیں کو

اب یہ عالم ہے
کہ دھرتی بھوک اُگلتی ہے
فلک آوازہ کستا ہے

لہو ارزاں ہے
پانی قیمتی
قدریں تہ و بالا
ہوائیں روح کو ڈستی ہیں
سورج آگ برساتا ہے،
انساں
اور کالے
اور کالے ہوتے جاتے ہیں

۱۹۶۷ء

بند پانی کا مُقدّر

ارتقا کا یہ تقاضا ہے کہ بڑھتے جاؤ
اور حالات کی ضد ہے کہ ٹھہرنا ہوگا
یعنی جینے کی تمنّا ہے تو مرنا ہوگا

میں ہوں بہتا ہوا پانی
مرا رُکنا ہے محال
نہر رُکتی ہے تو اک جھیل سی بن جاتی ہے
جھیل پھر جھیل ہے
سمٹی ہوئی شرمائی ہوئی

نہر پھر نہر ہے منزل کی طلب رکھتی ہے
جھیل ہے خود غرض اپنوں سے بھی رکھتی ہے عناد
نہر غیروں کو بھی سینے سے لگا لیتی ہے
جھیل سوئی ہوئی تقدیر کے مانند خموش
نہر سوئی ہوئی دُنیا کو جگا دیتی ہے
جھیل گم کردۂ منزل ہے، وطن سے بیزار
نہر کھوئی ہوئی منزل کا پتہ دیتی ہے
جھیل کم ظرف ہے تھوڑے پانی میں چھلک جاتی ہے
نہر بڑھتی ہے تو دریا کا گماں ہوتا ہے
جھیل پھر جھیل ہے
اک دائرۂ خاص میں بند
بند پانی کا مقدّر ہے فنا ہو جانا

۱۹۶۴

رُوح کی آواز

بہت ہوئے زندگی کے قصّے
بہت ہوئیں روشنی کی باتیں
ہزار صبحیں، ہزار شامیں
گذر گئیں یوں ہی ناگرفتہ مری نگاہوں کے سامنے سے
بہت سمیٹا، بہت سنبھالا
مگر نہ کام آئی کوئی کوشش
بکھر گیا میں فضائے گلشن میں مثلِ ذرّاتِ بے مقدّر
سرائے غربت ہے نامُرادی

وہ نامرادی بھی میری تقدیر بن چکی ہے
میں خود بھی تسلیم کر چکا ہوں
کہ حق و انصاف کی عدالت نے فیصلہ ٹھیک ہی دیا ہے
زمانہ اب دھجیاں اُڑائے کہ میں نے جُرمِ وفا کیا ہے
زمانہ دے مارے مجھ کو پتھّر پہ
میں نے پتھّر سے بھی وفا کے صنم تراشے ہیں
ٹھیک ہی ہے
ڈبو دے گنگا میں کوئی مجھ کو
کہ میں نے گنگا کی ایک اک موج دلربا میں
ہزار راتوں کی بے قراری کے گرم آنسو ملا دیئے ہیں
اگر کسی کی یہ آرزو ہے
تو میں بھی تیار ہوں کہ میرے لہو کے قطرے
وہ کوئے قاتل میں بیچ آئے
مگر کفن مجھ کو کون دے گا
یہ فیصلہ بھی یہیں پہ ہو گا
خموش تھا میں
کہ رسمِ گلشن بدل ہی جائے گی اک نہ اک دن
خموش تھا میں
کہ آتے آتے ہی آئیں گے وہ بہار کے دن

کہ جب غمِ زندگی کے پردے میں کوئی سازِ غزل چھڑے گا
وہ دن کہ جب آدمی کسی آدمی سے مل کر نہال ہو گا
شکم کو آسودگی ملے گی
ہر آدمی بوئے گل کی خاطر جتن کرے گا
مگر مرے خواب کی وہ تعبیر کیا خبر کس چٹان کے نیچے دب گئی ہے
ترس رہا ہوں میں قطرے قطرے کو
میکدہ بھی سراب سا ہے
نہ جانے ساغر کہاں ملے گا
کہاں مری تشنگی بجھے گی
بلک رہے ہیں گھروں میں بچے
اُبل رہا ہے ڈھکی ہوئی دیگچی میں پانی
سُلگ رہا ہے وجودِ انساں
سسک رہی ہے بھری جوانی
ہر ایک در تک رہا ہے رستہ
کہ بوئے نانِ جویں اب آئے
حیاتِ نو کا یقیں اب آئے
نہ آیا کوئی کسی کے در تک
مگر اجل کا پیام آیا
پڑا ہر اک در پہ قفلِ ابجد

کوئی کسی کے نہ کام آیا
میں کیا بتاؤں کہ موت پلٹتی رہی ہے اکثر تجوریوں میں
مگر کبھی ان تجوریوں پر پڑا نہ کوئی اجل کا سایہ
اجل تو ڈھانچہ تلاش کرتی ہے آدمی کا
تجوریوں کے قریب انساں کہاں ملیں گے
یہاں کوئی آدمی نہیں ہے
یہاں کوئی آدمی نہیں ہے
کہ آدمی سب سے پہلے اپنے وجود یا طن کو جانتا ہے
نقاب اندر نقاب ڈالے
کوئی اگر یہ سمجھ رہا ہے کہ اس سے بہتر کوئی نہیں ہے
تو اس سے بدتر بھی کون ہوگا
جو اپنے داغوں پہ سرنگوں ہو
اُسی کو میں آدمی کہوں گا
مشین بھی ایک شے ہے لیکن
مشین کچھ آدمی نہیں ہے
مشین کرتی ہے دیو پیدا
اور آدمی کا یہ حادثہ ہے
کہ خود سکڑتا ہی جا رہا ہے
ہوس نے دُنیا کو مار ڈالا

زمیں پہ جنگ و جدال کر کے
خلاء کی تسخیر کرنے والو
ہوس نہیں یہ تو اور کیا ہے
یہ اور شے ہے کہ بے ارادہ وقارِ انساں بھی بڑھ گیا ہے
وہاں بھی میرے ہی دست و بازو کی جلوہ سازی تمہیں ملے گی
زمانہ کتنا حریص نکلا
یہ میری آنکھوں میں جھانکتا ہے
کہ قطرۂ خونِ دل کدھر ہے
شکستِ چوبِ خودی سے پہلے ہی
پھوڑ ڈالا ہے میں نے نقارۂ وفا کو
میں خود یہ اعلان کر رہا ہوں
کہ بے وفائی ہے میرا شیوہ
مثال اس کی تو پہلے لاؤ
سمجھ رہے ہیں جو اس گلستاں کو بے خطر وہ اِدھر بھی آئیں
یہاں بھی دیکھیں کہ میرے چاروں طرف جہنّم دہک رہا ہے
ہر ایک شعلے سے میں نے کوئی گلاب کا پھول گڑھ لیا ہے
جو دیکھنا ہو تو آؤ دیکھو
کہ میری باہوں میں کیا نہیں ہے
مری ہتھیلی پہ لوگ ناحق اُجھی لکیروں کو دیکھتے ہیں

لکیریں بنتی بگڑتی رہتی ہیں
ان لکیروں میں کیا ملے گا
نظر اٹھاؤ
شجر کو دیکھو
ہر ایک شاخِ شجر میں تم کو
مری لکیروں کے پھل ملیں گے
ہر ایک گل میں
مری ہتھیلی کا ریشہ ریشہ جھلک رہا ہے
کہو تو میں پھر تمہیں دکھا دوں
مگر تمہیں سب سے پہلے فصلِ بہار سے دشمنی کرو گے
وہی ہو تم
جس نے ایشیا کے عظیم شہروں کو خاک و خوں میں ملا دیا ہے
فساد کا بیج بو کے کرتے ہو خونِ انساں سے آبیاری
خفا ہے دریائے نیل تم سے
پکارتا ہے لہو ویت نام کا تمہارا ہی نام لے کر
سنہرے خوابوں کا یہ جزیرہ
لہو کی ندّی میں بہہ رہا ہے
مگر کبھی ڈوبتا نہیں ہے
تم آدمی کو ہمیشہ اپنی سپید آنکھوں سے دیکھتے ہو

سیاہ فاموں کو قتل کر کے بھی تم سپیدی نہ لا سکو گے
لہو شہیدوں کا کہہ رہا ہے
لہو ہمیشہ لہو رہے گا
یہ ہر جگہ سُرخ رُو رہے گا،
میں آدمی کی تلاش میں ہوں
تم آدمی کو ہلاک کر کے مرے مقدّر پہ ہنس رہے ہو
کہو تو میں بھی ہلاک کر دوں تمہیں اور انساں کو ڈھونڈ لاؤں
مگر صد افسوس
تم نہ ہو گے تو کون دیکھے گا آدمی کو
میں چاہتا ہوں
کہ آدمی ایک دن تمہارے ہی دل سے اُبھرے
قریب آؤ
قریب آؤ
میں خود کو تم میں تلاش کر لوں
تم اپنے اندر مری وفا کو تلاش کر لو
تلاش کر لو کہ وقت اب بھی گیا نہیں ہے

۱۹۶۸ء

دھرتی کا سورج

رات اندھیری ہی سہی
رات بھیانک ہی سہی
رات کے قبضے میں خنجر سہی تلوار سہی
رات پھر رات ہے
سورج سے دہل جاتی ہے
آؤ مل جل کے پھر اک بار اُگائیں سورج
آسماں پر نہ سہی
اپنی ہی دھرتی پہ سہی

اسی دھرتی پہ جہاں ہم بھی اُگے تم بھی اُگے
اسی دھرتی پہ جہاں پھول بھی ہیں خار بھی ہیں
درد والے بھی ہیں چاہت کے طلب گار بھی ہیں
جنس نایاب بھی اور اس کے خریدار بھی ہیں
لطف جب ہے کہ وفا پر نہ کوئی آنچ آئے
دیکھنا پھر کوئی یوسف نہ کہیں بک جائے
روشنی پھیکی ہے
اشکوں کے دئیے گُل کر دو
ان چراغوں سے اندھیرا نہ کبھی کم ہوگا
کل بھی سورج نہ اُگے گا تو بڑا غم ہوگا

۱۹۶۴ء

فساد کا ایک منظر

ابھی ابھی اسی گھر میں
چراغ روشن تھے
خرامِ ناز تھی آنگن میں زندگی کی نسیم
کہ دفعتاً رُخِ ہستی بدل گیا جیسے
قضاء نے سادھ لی چُپ
مارِ آستیں کی طرح
گلی میں شور ہوا جیسے !
کہ جیسے جنگل میں

کسی مہیب دھماکے سے آگ لگ جائے
صدائے جہد کی ٹوٹی جو تان اکبر پہ
مکیں نے
بند در تیچے سے اک ذرا جھانکا
گلی میں خنجر و تیغ و سناں کی یورش تھی
اچانک آنکھ تلے چھا گیا اندھیرا سا
اچانک آتشِ نمرود جیسے پھیل گئی
ہوائے تند در تیچے سے گھر میں در آئی
سہم کے رہ گئیں ننھّی گلاب کی کلیاں
فسردہ شاخِ گل تر تھی ایک گوشے میں
سنان و تیغ کے نرغے میں آ چکی تھی نسیم
اجل کا ہاتھ پڑا زندگی کے دامن پر
" پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی "

۱۹۶۸ء

سِگار

عجیب ماحول ہے جہاں میں
سِگار کے کش لگا رہا ہوں
نہ کوئی ہمدم
نہ کوئی مونس
بُجھا بُجھا سا ہے شعلۂ دل
گھُٹی گھُٹی سی ہیں آرزوئیں
میں پی رہا ہوں سِگار لیکن
خیال آتا ہے زندگی کا
اور اس سے پہلے کہ جل بُجھے دل
میں جاننا چاہتا ہوں آخر
سگار کیا ہے ؟
تمار کیا ہے ؟
حقیقت نور و نار کیا ہے ؟
سگار
ظلمت کے تلخ پردے میں ایک مجبوب دلربا ہے
قبائے تہذیبِ تلخ میں ، دل جلوں کی رانی !

جلے تو کام آئے آدمی کے
بُجھے تو بے ننگ و نام سی شے
جَلے تو خوشبو فضا میں بکھرے
بُجھے تو بوئے وفا سے عاری
جلن
کہ عاشق کے دل کی خو ہے
جلن
کہ ہستی کی آبرو ہے
جلن سے ہی روشنی جہاں میں
جلن سے ہی غُل ہے کارواں میں
جو روشنی دے تو نور ہے یہ
جو گھر کو پھونکے تو نار کہیے
شکستِ کیف و سرور کو ہی خمار کہیے
غرض کہ ہستی سگار ٹھہری
مگر ہمارا سماج کیا ہے؟
جو غور کیجیے تو یہ شکستہ سماج بھی اک سگار ہی ہے
ہزار ہا سال کی پُرانی قبائے تہذیب تلخ ڈالے
تہوں پہ صدہا تہیں ہیں لپٹی
عجب نفاست عجیب حکمت

مگر حقیقت میں خشک پتّوں کے ماسوا کوئی شے نہیں ہے
اسے بھی کچھ آگ چاہیئے تھی
کہ خاک ہونا تو کام آتا
وہ آگ تو ہو چکی ہے پیدا
مگر ابھی دل کی گھاٹیوں میں الاؤ کا روپ بھر رہی ہے
عظیم لمحوں کا کارواں
وقت کا نیا پیچ دار رستہ بنا رہا ہے
بنا رہا ہے، مٹا رہا ہے
مٹا رہا ہے۔ بنا رہا ہے
کہاں کہاں کی نہ بات آئی
جنوں کا قِصّہ جو دل نے چھیڑا
چراغِ ہستی کا نام آیا
تو خونِ دل کی بھی بات آئی
جو چشمِ پرنم کی بات آئی
تو شامِ غم کا بھی نام آیا
چھیڑا جو داغِ جگر کا قِصّہ
تو ذکرِ ماہِ تمام آیا
میں جام گردھتا رہا ہمیشہ
مگر مجھی تک نہ جام آیا

مرا ہی خونِ جگر نچوڑا گیا
تو گردش میں جام آیا
کوئی بتائے کہ خون میرا
چمن میں کس کس کے کام آیا
زبانِ سوسن کبھی جو سوکھی
تو میں نے دل کا لہو دیا ہے
ایاغ گُل ہو چلا جو خالی
تو میں نے دل کا لہو دیا ہے
بہار تو پھر بہار ٹھہری
خزاں کے چہرے پہ خون مَل کر
خزاں کو بھی سرخ رو کیا ہے
یہ ہاتھ میرے ہی تھے جو دنیا کو ہر زمانے میں کام آئے
جو سعیٔ پیہم مری نہ ہوتی
تو پھول کھِلتے نہ آرزو کے
نہ ہوتیں بے کل جو میری یاہنوں کی مچھلیاں تو
فریب ہوتے نہ رنگ و بُو کے
زمیں کا جوبن پھٹا نہ پڑتا
یہ ابر بھی سرنگوں نہ ہوتا
جو میں نہ ہوتا

تو صیدِ قدرت پہ اپنا قبضہ کبھی یوں نہ ہوتا
مگر یہ کس کو سُنا رہا ہوں
یہ کون سا گیت گا رہا ہوں
ابھی تو ہر گیت ہے ادھورا
ابھی تو ہر تارِ دل ہے زخمی
ابھی تو محبوب کو بھی دنیا کے غم سے فرصت نہیں ملی ہے
ابھی تو جے چند و میر جعفر کا فیصلہ بھی نہیں ہوا ہے
ہر ایک کش پر سگار کے ساتھ
میں بھی پیہم سُلگ رہا ہوں
سلگ رہا ہوں کہ خاک ہونے سے پہلے دُنیا کو جگمگا دوں
اندھیری بستی میں پُرخطر راستوں پہ دو اک دیا جلا دوں
سلگ رہا ہوں
کہ عشق کی سرحدیں کہیں پھر سمٹ نہ جائیں
سلگ رہا ہوں کہ میری نسلیں رہِ صداقت سے ہٹ نہ جائیں
سلگ رہا ہوں
اور اس جلن کو سگار ہی کچھ سمجھ رہا ہے
سلگ رہا ہوں سگار سے میں
سگار مجھ سے سلگ رہا ہے

۱۹۵۵ء

پی۔ ال۔ ۴۸۰

ملا یہ فلسفۂ زندگی کسی سے ہمیں
ضمیر دانۂ گندم کے سامنے ہے حقیر
اندھیری رات جو ہوتی تو ہم سمجھ سکتے
مگر یہ دن کے اُجالے کی اور یہ تفسیر

شکم پہ باندھ کے پتھر بلا سے رہ جاتے
یہ خودکشی تو گوارہ کبھی نہ کرتے ہم
وہی کہ جس نے مسلّح کیا غنیموں کو
اُسی سے پھر یہ گذارش کہ اک نگاہِ کرم

یہ راہبر بھی ہمارے وفا کے پتلے ہیں
شکم پہ دھرتے ہیں قتلِ ضمیر کا الزام
خدا ہی خیر کرے خود پہ اعتماد نہیں
یہ ہمیلیٹ کا جنون ہے کہ خوابِ بندۂ دام

نہیں نہیں! یہ مقامِ جنون نہیں ہمدم
یہ عقل و ہوش یہ سازش کسی کی ہوگی
جو بجھ سکے گی نہ کل بھی لہو سے سینز کے
یہ ہو نہ ہو کسی بروٹس کی تشنگی ہوگی

۱۹۶۵ء

قتل

حسبِ معمول پھر اس شہر میں کل رات گئے
سایۂ معبدِ انصاف میں اک قتل ہوا
بات جو کانوں تک آئی ہے ہمارے
یوں ہے:
رات سنسان تھی،
خوابیدہ تھی ہر راہگذر
وقت: لمحے کی معیت میں سمٹ آیا تھا
محوِ سرگوشی ابھی ساغر و مینا تھے بہم
گھُپ اندھیرے میں اچانک کوئی خنجر چمکا
نرخرے سے کوئی اُلجھی ہوئی آواز اُبھری
جیسے لمحہ کوئی نیزے کی انی سے چھُو جائے
پھر وہاں کچھ بھی نہ تھا
کچھ بھی نہ تھا
کچھ بھی نہ تھا
آج کی تازہ خبر ہے کہ وہ قاتل سرِ شام
بیچ بازار سے فاتح کی طرح گذرا تھا

۱۹۶۷ء

نوحہ گر

شب، کیا بتاؤں، خواب میں گویا بچشمِ ہوش
دیکھا کہ ریگزار پہ بیٹھا ہوں میں خموش
ویراں ہے کائنات فضا ہے سکوں بدوش
مے ہے نہ میکدہ ہے نہ ساقی نہ مے فروش
نانِ جوینِ خشک ہے اور زخم نائے و نوش
اتنے میں ایک مردِ کہن سال و خرقہ پوش
آنکلا میری سمت عصا ٹیکتا ہوا
دیکھا جو میں نے اُس کا سراپا تو ڈر گیا
گذرا یہی خیال فرشتہ ہے موت کا
لیکن مجھے یہ ہمّتِ عالی نے دی صدا
کیا دیکھتا ہے؟ آ گئے خضرِ خجستہ پا
واللہ کام آگئیں خوش فہمیاں مری

گویا دوبارہ مجھ کو ملی زندگی ملی
پوچھا حضور والا کی تعریف؟ آدمی!
دولت کدہ؟ جواب میں بولا کہ زندگی!
آتے کہاں سے ہیں؟ تو وہ کہنے لگا ابھی
میں آ رہا ہوں منزلِ باغ و بہار سے
کیا پوچھنا ہے اور بھی کچھ خاکسار سے؟
دو لمحہ بعد خود ہی وہ بولا بصد خلوص
میرے عزیز اس کا برا ماننا نہ تم
واماندگی نے کر دئے ہیں ہوش و حواس گم
صہبائے زندگی سے تہی ہو چلا ہے خم
ہوں منتظر کہ آئے کہیں سے صدائے قم
چھیڑوں بھی میں تو کیا کسی عیسیٰ نفس کی بات
ہوں گردِ کارواں میں کروں کیا جرس کی بات
ہے سچ تو یہ کہ اب یہ نہیں میرے بس کی بات
میں ہوں اب اور رہائی مرغِ قفس کی بات
صد حیف وہ بہار کا موسم وہ گلستاں
ہے جاں گسل خدا کی قسم یادِ رفتگاں
ذکرِ شباب و شعر تھا اور بزمِ دوستاں
میں بھی تمہاری طرح کسی وقت تھا جواں

ٹھوکر میں تھی زمیں تو ہتھیلی پہ آسماں
بے باک تھا اور آج بھی ہوں صورتِ خیال
رستے میں ٹوک دے یہ کسی کی نہ تھی مجال
اک لمحہ سے زیادہ نہ تھی عمر ماہ و سال
مشہور تھا اگرچہ زمانے میں خوش خصال
سینے سے میں لگائے پھرا کاسۂ سوال
حق گوئی میرا شیوہ، خودی میری زندگی
پاداش اس گناہ کی کیا کچھ نہیں ملی
نانِ جوینِ خشک پہ اک عمر کٹ گئی
اور وہ بھی قرض کی مرے ہمراز قرض کی
المختصر یہ قصہ ہے میری حیات کا
پیاسوں پہ جیسے بند ہو پانی فرات کا

اتنا کہا تھا اس نے کہ دو چشم واژگوں
اُٹھے مری طرف لئے دو قطرہ ہائے خوں
دو قطرہ ہائے خوں بھی زمیں پر ٹپک پڑے
میں کیا بتاؤں میرے بھی ساغر چھلک پڑے
گویا نچوڑ زندگیِ نامراد کا
مژگانِ تر سے چھوٹ کے صحرا میں کھو گیا

جز حرفِ تعزیت مرے پاس اور کچھ نہ تھا
وہ میری سمت اور میں اُسے دیکھتا رہا
کاغذکی روٹیاں تھیں نگاہوں کے سامنے
دیکھا تھا جن کو غور سے اس تشنہ کام نے
شاید غریب بے سروپا جان کر مجھے
دیکھا بہ غور اُس نے قریب آن کر مجھے
رونے لگا وہ اور بھی پہچان کر مجھے
اک آہِ سردِ کھینچ کے مجھ سے لپٹ گیا
کہنے لگا کہ مجھ کو خدا را نہ بھولنا
تو ہے مرا شباب تو میں نوحہ گر ترا
تو آفتابِ صبح ہے میں آفتابِ شام
تو بھی انیس امام ہے میں بھی انیس امام
نام اُس کا سنتے ہی مری آنکھیں اُبل پڑیں
جائے پناہ مجھ کو دکھائی نہ دی کہیں!
یہ پیکرِ ضعیفی ہے میرا؟ نہیں! نہیں!!

لیکن کھلی جو آنکھ تو دنیا ہی اور تھی
وہ مردِ پیر تھا نہ وہ صحرا نہ وہ مقام
ہستی کی بھاگ دوڑ تھی اور مہر تیز گام

۱۹۶۳ء

ذات کا کرب

چمن جسے کہہ رہی ہے دُنیا
وہ میرے بازوئے زخم خوردہ کی داستاں ہے
کہاں کوئی اب گلاب کھِلتا ہے اس زمیں پر
کہاں کوئی غنچۂ شگفتہ نظر آتا ہے شاخِ گل میں
خزاں نے پھولوں پہ رکھ کے الزامِ خودکشی
صاف اپنا دامن بچا لیا ہے
کھڑا ہوں میں دشتِ بیکراں میں
مسافرِ بے نوا کی صورت

پکارتا ہوں
مگر صدائے ضمیر بھی اب مری طرف لوٹتی نہیں ہے
کرن کرن آفتاب کی
اس زمین کے باسیوں کی نیّت سے ڈر گئی ہے
وہ ایک سایہ
جو میرا ہوتے ہوئے بھی مجھ سے سہم کے قدموں میں آ گیا ہے
مجھی کو خورشید جانتا ہے
مگر ابھی دیر ہے کہ رفتارِ روشنی میرے ہاتھ آئے
جو بس میں ہوتا تو اس زمیں کو
میں سوئے خورشید اُچھال دیتا
زمین
رفتارِ روشنی کے ہزار برسوں کے پار ہوتی
کسی سُنہرے اتھاہ ساگر کے بیچ کھلتی جب آنکھ اس کی
تو دیکھ لیتی
وہی زمانہ، وہی تماشے
تمام کردار بھی وہی
جن کے نام اوراقِ کِرم خوردہ میں رہ گئے ہیں
زمین والوں نے اپنی اپنی غرض کو پیشِ نگاہ رکھ کر
ہزاروں افسانے گڑھ لئے ہیں

نگاہ والے یہ دیکھ لیتے
فسانے تحلیل ہو رہے ہیں
حقیقتیں سر اُٹھا رہی ہیں
مگر مجھے ان فسانہ سازوں سے کیا شکایت
تلاش مجھ کو ہے اس خدا کی
جو روبرو آ کے صاف کہہ دے
کہ :
تیری انسانیت تقاضائے بے بسی ہے
زمین پر میں نے صرف شیطان کو اُتارا
یہ ارتقاء بس مرے ارادوں کا سلسلہ ہے
یہاں کوئی آدمی نہیں ہے
یہاں کوئی آدمی نہیں ہے

۶۱۹۷۰

جوہرِ گُم شدہ

ٹپک گیا جو مری چشمِ یاس سے وہ لہو
رگوں میں لَوٹ کے آیا نہ جزوِ خواب بنا
نہ جی سکا نہ کوئی حرفِ انقلاب بنا
زمیں میں جذب ہوا یوں کہ جیسے کچھ بھی نہ تھا
بس ایک بوند کا حلقہ سراب کے مانند
زمیں کی کوکھ میں ہوتا تو پھول بن جاتا
ندا زمیں سے یہ آئی کہ تجھ کو کیا معلوم
چمن میں دیکھ وہ تنہا جو کھِل رہا ہے گلاب
ترے لہو نے ہی چہرے پہ ڈال لی ہے نقاب
فضا میں رقص جو کرتا تو نور بن جاتا
وطن پرست بنا تھا تو لے گلاب سے کھیل
میں پھر بھی تجھ سے کہوں گی کہ آفتاب سے کھیل

کھوکھلا درس

ہر میکدے کے در پہ کھڑی ہے سپاہ شام
پہچان کے لئے
حیرت فزا ہے راہِ محبّت میں یہ مقام
انجان کے لئے
چھُپ چھپ کے شیخ جی بھی لُنڈھانے لگے ہیں جام
حُبِّ وطن کے نام
شیشہ بھی خام بادۂ انگور بھی ہے خام
اللہ رے اہتمام
دو ایک محوِ عیش ہیں باقی ہیں تشنہ کام
سچ بولنا ہے جُرم سنبھالے رہو لگام
دیوارِ میکدہ پہ ہے لکھا یہی تمام
آرام ہے حرام
آرام ہے حرام

۶۱۹۶۳

یہ کیا ہے کبیرا بول ذرا!

جب بادِ صبا اٹھلاتی ہے ‏ ‏ صرصر کو ہنسی آجاتی ہے
جب آتشِ گل لہراتی ہے ‏ ‏ گلچیں کی ہوس بڑھ جاتی ہے
جب آس کی کرنیں اُگتی ہیں ‏ ‏ ظلمت کی کماں کھنچ جاتی ہے
جب محنت پھلنے لگتی ہے ‏ ‏ محنت پہ خزاں غُرّاتی ہے

یہ کیا ہے کبیرا بول ذرا!

یہ گھاو ہے کس کے سینے کا؟ ‏ ‏ ٹوٹا ہوا کس کا بازو ہے؟
کس حسنِ نظر کی برکت ہے؟ ‏ ‏ کس چشمِ سیہ کا جادو ہے؟
یہ لاش ہے کس کے ارماں کی؟ ‏ ‏ وہ قاتل کون سا گُرو ہے؟
یہ جانِ بہاراں کس کے لئے؟ ‏ ‏ وہ آخر کون سا پہلو ہے؟

یہ کیا ہے کبیرا۔ بول ذرا!

کیوں جنسِ وفا کی قدر نہیں؟ کیوں دیوانے بدنام ہوئے؟
سب لوگ رہے پیاسے لیکن دو چار شریک جام ہوئے
حالات وہ آخر کیسے تھے کیوں انساں خون آشام ہوئے

یہ کیا ہے کبیرا بول ذرا!

ہر نخلِ وفا بے جان ہوا ہر شاخِ محبّت خاک ہوئی
چُن چُن کے نشیمن کو پھونکا کیوں آگ اتنی چالاک ہوئی
آغوشِ محبّت کیوں آخر غنچوں کے لئے فتراک ہوئی

یہ کیا ہے کبیرا بول ذرا!

کیوں سویا ہے کیا یاد نہیں
ہر رات کی اک حد ہوتی ہے
وہ رات ہو، چاہے جیسی بھی
بازیچۂ سرمد ہوتی ہے

۱۹۵۵ء

لہو ترنگ

زباں کھلتی نہیں رودادِ گلشن ہو بیاں کیوں کر
مری جرأت پہ خوش ہو گا نقیبِ آسماں کیوں کر
مجھی کو بھول جائیں گی قفس کی تیلیاں کیوں کر
مگر یہ بھی ہے غیروں کو ہو فکرِ گلستاں کیوں کر

پسِ دیوارِ گلشن تاک میں ہیں سنگ دل اب بھی
چمن میں فتنہ ساماں ہے سمومِ جاں گُسل اب بھی
ہر اک آہٹ پہ کلیوں کا دھڑک جاتا ہے دل اب بھی
صبا ہے اپنے ناکردہ گناہوں پر خجل اب بھی

مگر صد حیف گلشن میں ہے گلچیں سُرخ رو اب تک
نچوڑا جا رہا ہے جسمِ لاغر سے لہو اب تک
خوشا اے دل کہ ہے زندہ مرا ذوقِ نمو اب تک
مرے ہی دم سے قائم ہے چمن کی آبرو اب تک

مزاجِ باغباں لیکن مجھی سے آج برہم ہے
تو تیغِ ستم اس دَور میں ہر ابنِ آدم ہے
نظر آتی نہیں منزل اندھیرے کا یہ عالم ہے
چراغوں میں لہو جلتا ہے پھر بھی روشنی کم ہے

جدھر دیکھو اُدھر اک عالمِ ہو ہے جہاں میں ہوں
متاعِ دل بقدرِ یک سرِ مو ہے جہاں میں ہوں
روا ہر سمت آئینِ من و تو ہے جہاں میں ہوں
فروغِ تشنہ کامی بر لبِ جو ہے جہاں میں ہوں

نہ گُل چہکے نہ گلشن میں بہاروں کا پیام آیا
نہ مے خانہ سجا اب تک نہ ہم تک دورِ جام آیا
گنہگاروں میں لیکن جب بھی آیا میرا نام آیا
خدا رکھے جہالت کا اندھیرا کچھ تو کام آیا

کھلیں گے گُل، نہ فِکر تنگ دامانی ستائے گی
نہ سُورج مسکرائے گا نہ صبحِ جشن آئے گی
بغاوت صحنِ گلشن میں کہاں تک سر اُٹھائے گی
شکایت کی زباں خود رفتہ رفتہ سوکھ جائے گی

وفا عنقا، جفا لازم، تنفُّر حاصلِ ایماں
چمن افسردہ، دل پُر خوں، زباں عاجز، نظر حیراں
دُہائی دیجئے کیا کیا ہوئے ہیں موت کے ساماں
تعصّب کی فضاء نے کارِ گلچیں کر دیا آساں

قیامت ہو گئی برپا کسے اب ہوش آئے گا
جسے وہ خار کہتے ہیں وہ کیا ہمّت دکھائے گا
نہ دامن کوئی تھامے گا نہ گلچیں خوف کھائے گا
عدالت تک ثبوتِ تارِ داماں کون لائے گا

۱۹۶۴ء

انصاف کا جنازہ

کرے تو کس سے کرے جا کے اب کوئی فریاد
وہی گواہ بھی فریاد رس بھی، قاتل بھی
بیانِ اہلِ وفا معتبر نہیں تو کوئی
کسے گواہ کرے، کس کو ہم نوا ٹھہرائے
عجیب رسمِ چمن ہے عجیب طرزِ وفا
سموم جائزہ لیتی ہے ہر گلِ تر کا
قدم قدم پہ ہے آئینِ حسن و عشق جدا
روش روش پہ ہیں تقسیمِ گُل کے ہنگامے
یہ فلسفہ بھی بہت خوب ہے وطن کے لئے
چمن کو لُوٹ لو آرائشِ چمن کے لئے
سحر کو دو یہ ہدایت کہ جلوہ عام نہ ہو
کوئی صنم کسی آذر سے ہم کلام نہ ہو

۶۱۹۶۶

اقبالِ جُرم

لوگ بدنام کرتے ہیں ناحق مجھے
بزمِ عیش و طرب میں بھی تلوار ہوں
دیکھتے ہی مجھے پھیر لیتے ہیں مُنہ
جیسے میں ہی تو پہلا گنہگار ہوں
اس سے البتّہ انکار ممکن نہیں
میں شبِ غم میں سورج کا اقرار ہوں
بات دوٹوک کرنا ہے فطرت مری
جھوٹ مجھ کو نہ آئے تو میں کیا کروں

گردنِ خر میں ہے طوقِ زرّیں یہاں
صاحبِ علم و حکمت گنہگار ہے
جی حضوری میں پوشیدہ نام آوری
ماسوا اس کے ہر علم بے کار ہے
رکھ کے زخموں پہ خنجر مرے آج بھی
شام کو صبح کہنے پہ اصرار ہے
بارہا مُوند لیں میں نے آنکھیں مگر
دل جو دھوکا نہ کھائے تو میں کیا کروں

پا بہ زنجیر کرتے رہے وہ مجھے
میں کہ صحرا میں بھی گُل کترتا رہا
زخم سینے کے رِستے رہے اور میں
رنگ تصویرِ جاناں میں بھرتا رہا
تلخ حالات پیدا وہ کرتے رہے
میں کہ حالات سے جنگ کرتا رہا
مجھ پہ احساں انہوں نے کئے اس قدر
اب کوئی یہ بتائے کہ میں کیا کروں

صاف گوئی اگر واقعی جرم ہے
جرم کا اپنے اقبال کرتا ہوں میں
چارہ جوئی اگر واقعی جرم ہے
جرم کا اپنے اقبال کرتا ہوں میں
قتل کر دو مجھے، دار پر کھینچ دو
زندگی مجھ کو ایسی گوارا نہیں
جس میں ذلّت ملے نیکیوں کے عوض
جس میں انسانیت کا گذارا نہیں
زندگی مجھ کو ایسی گوارا نہیں

۱۹۶۳ء

آئینے ٹوٹ گئے

آئینے ٹوٹ گئے
کون دکھائے کس کو
کوئی چہرہ کسی چہرے سے جُدا بھی تو نہیں
شعلے نفرت کے وہی
آگ عداوت کی وہی
خونِ ناحق بھی وہی
خنجرِ قاتل بھی وہی
غنچے کمہلا گئے

پھولوں کی قبا چاک ہوئی
سُرخرو خارِ مغیلاں ہوئے
گل چیں خوش کام
بوئے خوں، بوئے نفس، بوئے حنا ایک ہوئی
قاتل آزاد ہیں
مقتول ہی مجرم ٹھہرے
بیکسی جھول رہی ہے سرِ مقتل یوں ہی
ہاتھ کیوں کر کوئی اب نوکِ سناں تک پہنچے
راستہ کاٹ گئی پھر کوئی کالی بلّی
پھر قدم رُک سے گئے آخرِ شب کی صورت
پھر وہی مصلحت آمیزیٔ اربابِ چمن
پھر وہی جرم کی تقسیم
وہی صلح کی بات
ہم کہاں ہیں؟
کوئی اک بار بھی آواز تو دے
کیسی وادی ہے کہ ہر شمع بجھی جاتی ہے؟
ہم ویت نام کے زخمی ہیں
فلسطین کے مظلوم عوام
جُرمِ عیسیٰ کے مقلّد

نئی دنیا کے نقیب

ہم نے گوتم کے

مہابیر کے غم جھیلے ہیں

ہم نے صحراؤں میں شبّیر کے غم جھیلے ہیں

ہم ازل سے ہیں جواں دار و رسن کے صدقے

قتل گاہوں میں ہی تجدیدِ وفا کرتے ہیں

قتل گاہیں جو اندھیروں نے سجا رکھی ہیں

قتل گاہیں جنھیں سورج سے عداوت سی ہے

درد کی چھاؤں میں بیٹھا ہے مسافر تنہا

نوکِ مژگاں پہ لئے ریزۂ آئینۂ دل

دیکھئے کب شبِ ہجراں کی سحر ہوتی ہے

۱۹۷۰ء

خلاء

آدمی!
شاخِ بریدہ کی طرح خاک بسر
ناگنیں رینگ رہی ہیں خس و خاشاک کے بیچ
زرد پتّوں کا اک انبار ہے
اب کوئی روش ہے نہ کوئی تختۂ گل

زندگی!
خاک کے تودے سے خفا
وسعتِ افلاک میں گُم
لوٹ آئے تو سمجھنا
کہ وفا راس آئی

۱۹۷۱ء

VACOUM ے

زندگی کا ایک اہم بیان

خودکشی میرا نہ شیوہ ہے
نہ مجبوری ہے
میں وہ دریا ہوں کہ ہر موج ہے منزل میری
مجھ کو ہر دور نے اک رنگ، اک آہنگ دیا
مجھ سے شاکی بھی رہا
میرا ثنا خواں بھی رہا
تودۂ خاک میں گھر جب سے کیا ہے میں نے
مستقل سوئے فلک رہتی ہے پرواز اپنی
آج لیکن مرے ہاتھوں میں قلم دے کے مجھے
حکم ملا ہے کہ لکھوں

"دار پہ کھینچی جاؤں"

آہ! اُس پیکرِ خاکی کا مقدّر جس نے
مجھ سے پیمانِ وفا توڑ کے غدّاری کی
میں تو اک موجِ ہوا ہوں
کبھی ٹھنڈی کبھی گرم
سرد ہوتی ہوں تو ہر آدمی جم جاتا ہے
شعلہ ہوتی ہوں تو خورشید بھی شرماتا ہے
مجھ کو کہنا ہے بس اتنا ہی
کہ اے تودۂ خاک!
حُسن ہر آئینے کو، آئینہ گر دیتا ہے
عکسِ رُخ بھی کسی گُل رُو کی خبر دیتا ہے
دستخط
زندگی!
تاریخ صفر
جرم!
وفاداریٔ اربابِ قلم

۱۹۷۱ء

شبابِ تیرہ شبی

یہی ہے شاید وہ دَور جس میں
تباہیوں کا عروج ہوگا
سیاہیاں پھیل کر زمانے کو ڈھانپ لیں گی
کدورتوں کے غبار اٹھیں گے چشم و دل سے
ہوس پرستوں کی محفل ہائے و ہو سجے گی
ہر آدمی
ایک دوسرے کی برائیوں میں شریک ہوگا
جنوں کی بے چارگی بڑھے گی

زبانِ قاتل میں آبِ خنجر کو ہی مئے زندگی کہیں گے
پھر اُس کے بعد ایک دور آئے گا
لوگ ڈھونڈیں گے آدمی کو

حصارِ دل میں ہی
داغِ ہجراں سے پھر کوئی روشنی کرے گا
سکون کی سانس لے گی دُنیا
نیا زمانہ شروع ہوگا
بہار کا قافلہ سجے گا
حیات کی گفتگو چھڑے گی

شبابِ تیرہ شبی ہے پیغامِ صبحِ فردا
یقین جانو!
یقین جانو! کہ ضربِ تیشہ کو چوم لینی ہے کامرانی
اسی سے پھوٹے گا چشمۂ آبِ زندگانی

۶۱۹۶۸

عروجِ آدم

سفرِ خلاء کا مبارک ہو گا گرن تجھ کو
ہوئی ہے سطحِ زمیں رشکِ آسماں تجھ سے

وسیع اور بھی کچھ ہو گیا جہانِ عمل
عظیم تر ہوئی تقدیرِ خاک داں تجھ سے

نشانِ امن ہوا اور بھی بلند و عظیم
محبّت اور بھی کچھ ہو گئی جواں تجھ سے

جبینِ ناز پہ چُھننے کے واسطے افشاں
ہے خاکِ پا کی طلب گار کہکشاں تجھ سے

نیا زمانہ، نئی زندگی ، نئی اقدار
شروع ہو گی نئی ایک داستاں تجھ سے

چہک اُٹھے ہیں گلستانِ آرزو میں طیور
مہک اُٹھی ہیں تصوّر کی وادیاں تجھ سے

جہانِ فکر میں آگے وہ ہو تو ہو لیکن
عمل کی راہ میں پیچھے ہے برگساں تجھ سے

ہمیں یقیں ہے کہ تسخیر ماہ و مہر کے بعد
سُلجھنے والی ہیں کچھ اور گتھیاں تجھ سے

قدم ترا رہِ تسخیر مہر و ماہ میں ہے
عروجِ آدمِ خاکی مری نگاہ میں ہے

۱۹۶۱ء

جشنِ مہتاب

جشنِ فروغِ عشق منانے کی رات آئی
بزمِ تصوّرات سجانے کی رات آئی
پھر شہرِ آرزو کو جگانے کی رات آئی
تاروں سے رسم و راہ بڑھانے کی رات آئی

ہاتھوں نے میرے پیار کا جادو جگا دیا
گھونگٹ جبینِ ماہِ مبیں سے اُٹھا دیا

وسعت ملی خیال کو، آنکھوں کو جلوہ گاہ
پائے جنوں کو اذنِ سفر، درد کو پناہ
روشن ہوئی کچھ اور محبّت کی بارگاہ
عقلِ رسا نے کھول دی اک اور شاہراہ

جوہر کھلے ہیں اب کہیں جا کر حجاب کے
لو! اور بھی قریب ہوئے آفتاب کے

فطرت ہے میرے سایۂ شفقت میں آج کل
انساں مکیں ہے چاند کی خلوت میں آج کل
سارا نظامِ عرش ہے حیرت میں آج کل
فردا بھی حال کی ہے معیت میں آج کل

یہ فتح اصل میں ہے نظام و اصول کی
دل نے خرد کی راہ نُمائی قبول کی

موجِ بہار، آبلۂ پا کی لہر ہے
خوشبو، مئے نشاطِ تمنّا کی لہر ہے
بجلی، تصوّرِ رُخِ فردا کی لہر ہے
افلاک، میرے شوق کے دریا کی لہر ہے

پی کر شرابِ عزم جو اُٹھا زمین سے
آنسو فلک کے پونچھ دیئے آستین سے

راکٹ، نشانِ فتح وظفر ہے ذہن کا
راکٹ، نشانِ قوتِ نو ہے یقین کا
راکٹ طلسمِ ہوش فزا ہے مشین کا
ہونے نہ دیں گے سانپ اسے آستین کا

اہلِ زمیں کو چاہیئے سب کی خبر رہے
ہو پاؤں چاند پر تو زمیں پر نظر رہے

۱۹۵۹ء

دیارِ دار و رسن

فضائے رنج و محن پر سکوت طاری تھا　　دیارِ دار و رسن پر سکوت طاری تھا
زمینِ شعر و سخن پر سکوت طاری تھا　　غرض کہ سارے چمن پر سکوت طاری تھا
کہ ایک رات یہ ظلمت نے مسکرا کے کہا
مقامِ عشق سے اب کوئی آشنا نہ رہا
یہ سنتے ہی جو مجھے دفعتاً جلال آیا　　لباسِ فکر میں فردائے خوش جمال آیا
ادب سے سر کو جھکائے گدائے حال آیا　　پلٹ کے قافلۂ روز و ماہ و سال آیا
ابھی تو کی بھی نہ تھی میں نے شعلہ افشانی
فلک پہ عام ہوئی تیرگی کی نادانی
جو دیکھا حال نے مستقبلِ حسیں کی طرف　　نگاہِ دوش نے کی حالِ بے یقیں کی طرف
ادب سے سب نے جھکائی نظر زمیں کی طرف　　مکاں نے سر سے اشارہ کیا مکیں کی طرف
مرے جلال کا قصہ جو یوں چمن میں چھڑا
وفا کا ذکر ستاروں کی انجمن میں چھڑا

اگرچہ سینکڑوں قصّے مری وفا کے ہوئے
بہ شرح و بسط مگر دورِ ابتلا کے ہوئے
امین وفا ان کے ہوئے تانتیا ٹوپیا کے ہوئے
وفائے لکشمی و پیر پارسا کے ہوئے

مگر جو گفتگو اک مردِ پیر کی آئی
فسانۂ شبِ وحشت میں زندگی آئی

بیانِ قصۂ دار و رسن نہ تھا منظور
کچھ ایسی بات مگر تھی کہ میں ہوا مجبور
نہ دوش کی یہ خطا تھی نہ حال کا ہی قصور
مجھے دراصل مٹانا تھا تیرگی کا غرور

غرض یہ بات جب اپنوں کے درمیاں چھیڑی
بیک زباں یہی تینوں نے داستاں چھیڑی

یہ سرزمینِ کنور سنگھ شہر دار و رسن
یہ سرزمین جواں سال فوجیوں کا وطن
پہنا چکی ہے جو سو بار دشمنوں کو کفن
امینِ رازِ گلستاں، غرورِ سرو و سمن

مقامِ عشق و مقامِ وفا یہیں پہ ملا
جنوں کا درس اسی خطۂ زمیں پہ ملا

سنان و تیغ کا خطّہ زمینِ چنگ و رباب
ہمیشہ تند رہی اس کے میکدے کی شراب
لکھی گئی ہے یہیں داستانِ عہدِ شباب
لہو چھڑک کے اُگائے گئے یہیں پہ گلاب

کنارِ سوق میں اک گلعذار ہے یہ زمیں
نشانِ منزلِ طوفان و دار ہے یہ زمیں

ہر ایک ذرّہ ہے اک حرفِ انقلاب اس کا
ہر ایک لے اُت بدلتا رہا ہے خواب اس کا
ازل سے برجِ حمل میں ہے آفتاب اس کا
کفن بدوش ہمیشہ رہا شباب اس کا

جھکا دیا سرِ میدان سرِ غرور اس نے
سناں کی زد پہ اچھالا ہے کوہِ نور اس نے

جواں ہے اب بھی دصنیرا کا قصۂ شب تار — جہاں کیا تھا حلیفوں نے دشمنوں کو شکار
برس پڑے کبھی افرنگیوں پہ مثلِ شرار — فرس بڑھا کے کبھی تیز کرلی تیغ کی دھار

اُٹھے نہ گر کے موئے جدھر بھی وار کیا
وطن کی خاک کو شیروں نے لالہ زار کیا

یہ سرزمیں کہ جسے رشکِ صد ارم کہیے — متاعِ قلب و نظر قسمت اُمم کہیے
مگر بطرزِ دگر مرکزِ ستم کہیے — زبانِ رہرو منزل میں دشتِ غم کہیے

یہ جلوہ گاہِ شجاعت یہ لالہ زارِ کہن
ازل سے بیشۂ ضیغم ہے شیر خاں کا وطن

یہ کہہ کے ہو گئے رخصت سبھی بجز اک حال — بصد ادب وہ یہ بولا نہ تھی مری یہ مجال
مگر جب آ ہی گیا سامنے وطن کا سوال — تو عرض کردوں حقیقت ہوا یہ دل میں خیال

عجیب کچھ ہے ادھر گلشنِ حیات کا رنگ
نہ موت کی ہی تمنّا، نہ زندگی کی اُمنگ

کبھی نہ ہوں گی مکمل وفا کی تفسیریں — ہر ایک صبح بدلتی رہیں گی تعبیریں
یہ روز و شب کے مسائل یہ غم کی زنجیریں — میں چاہتا ہوں پھر اُبھریں یہیں سے تنویریں

اُٹھو کہ صبحِ گلستاں ہے داغدار اب بھی
خزاں کی گود میں ہے شاہدِ بہار اب بھی

۱۹۵۷ء

میں

نہ پوچھو ہمسفیرانِ چمن مجھ سے کہ کیا ہوں میں
اسیرِ دامِ مجبوری، گرفتارِ بلا ہوں میں
ستم احباب کے، ناقدریاں رندانِ محفل کی
غرض اس محفلِ ہستی میں ٹھکرایا ہوا ہوں میں
لٹا کر دولتِ دل، بہرِ تعمیرِ چمن خوش تھا
مگر بے مہریٔ ایام پر اب سوچتا ہوں میں
مداوائے غمِ دنیا کی حسرت دل میں رہتی ہے
مداوائے غمِ خود سے مگر ناآشنا ہوں میں

کسی فن کار کے مرنے کی سنتا ہوں خبر جب بھی
یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا مر گیا ہوں مَیں

نہ کشتی ثابت و سالم، نہ لنگر ہے نہ ساحل ہے
سراپا چھید ہوں، خود موج ہوں خود ناخدا ہوں مَیں

بہت دل چسپ تھا نظارۂ مہر و مہ و انجم
بھری محفل میں لیکن خود تماشا بن گیا ہوں مَیں

میں جو کچھ بھی ہوں مَیں ہوں میری ہستی گم نہیں ہوتی
چمن ہے نغمہ خواں جس پر وہ سازِ ارتقا ہوں مَیں

مرا خونِ جگر بنتا ہے غازہ چہرۂ گُل کا
لہو دے کے ویرانے کو رنگیں کر رہا ہوں میں

ازل سے جل رہا ہوں انتظارِ صبحِ روشن میں
چراغِ رہگذارِ عشق ہوں شمعِ وفا ہوں مَیں

مرے نغموں سے پیدا ایک ہلچل شہر یاروں میں
حریفِ شہر یاری دشمنِ جور و جفا ہوں مَیں

چمن بندی سے میری انجم و مہتاب بھی لرزاں
کہ بزمِ عالمِ خاکی کو سجنا چاہتا ہوں میں

کبھی میری ضرورت ہو جو تم کو کارواں والو!
تو پھر آواز دے دینا کہ آگے بڑھ گیا ہوں مَیں

۱۹۵۵ء

انتہائے ضبطِ غم

بہت قریب سے دیکھا جو آئینہ میں نے
جگر پہ چوٹ پڑی دل میں ہوک سی اُٹھی
خدا کرے نہ کوئی ہو سیاہ رو مجھ سا
نہ کوئی داغ ہی چمکا نہ کوئی زخم بھرا
خدا کرے نہ شہیدِ وفا ہو دشمن بھی
خدا کرے نہ کوئی اب کسی کے کام آئے
خودی رہے نہ خدائی کا مسئلہ اُٹھے
نہ دل رہے نہ اُٹھے آرزو کی لاش کوئی

فلک رہے نہ رہے چشمِ دُور بیں نہ رہے
ستم گروں کے سوا کوئی بھی کہیں نہ رہے
بہار آئے نہ گلچیں کا کاروبار چلے
چمن میں دھول اُڑے آشیاں بکھر جائے
گذر سکے تو قیامت ابھی گذر جائے
کوئی کہاں تک اُٹھائے صلیبؔ دار کے ناز
کوئی کہاں تک اب اُس دن کا انتظار کرے
کہ کوئی پھول کھِلے زندگی کی وادی میں

۱۹۶۷ء

روشنی کا المیہ

چٹانیں ریزہ ریزہ ہو چکیں
اب اور کیا ڈھونڈیں
کوئی خوش رنگ پتھر بھی نہیں ان سنگریزوں میں
خدا مصلوب ہے،
انساں مقید،
زندگی دوبھر،
دلوں پر تیرگی قابض
چراغوں میں لہو کم

کوچہ و بازار میں ارزاں،
محبت! نام مجبوری
خوش اخلاقی! حماقت
صاف گوئی! جرم
آزادی! سگانِ بوالہوس کی شہر پیمائی،
بغاوت! کرم خوردہ بیج کے مانند
ہر دل میں نہاں
بے چارگی! سنگِ درِ جاناں
خزاں جب تک سلامت ہے
سوال انقلابِ رنگ و بو پیدا نہیں ہوتا
اسی دھرتی کو شاید ہو کوئی جنبش
کبھی لاوا کوئی پھوٹے
غلاظت خاک ہو جائے
وہی رہ جائے جو کندن بنے اور سرخرو ٹھہرے
تو ممکن ہے تلاشِ صبح کا احساس پیدا ہو

۱۹۷۱ء

سوالیہ نشان؟

ذرا ٹھہرو! ذرا ٹھہرو!
سیہ جذبات کے دھارے میں بہ جانے سے کیا ہوگا
سمجھنے دو مجھے
یہ جنگِ آزادی ہے یا رقصِ سیہ کاراں؟
تعصّب کا سفر ہے یا تلاشِ موسمِ گل ہے؟
بہت دیکھے ہیں میں نے بھی جنوں بردوش ہنگامے
کہیں اخلاص خنجر در بغل، محتاط غم خواری
کہیں بربادیٔ جاں بر سبیلِ مشقِ جاں بازی

طلسمِ سیم و زر تاریکیوں میں جگمگاتا ہے
تمہیں بھی آزماتا ہے
مجھے بھی آزماتا ہے
ردا مظلومیت کی اوڑھ لینے سے کوئی قاتل نہیں چھپتا
ذرا سوچو!
تلاشِ موسمِ گل کا خزاں کیوں ساتھ دیتی ہے؟
اندھیرے ایک ہو جاتے ہیں کیوں شب ہائے ہجراں میں؟
اُجالے عذر کرتے ہیں، کبھی یکجا نہیں ہوتے

بہت افسوس ہے
کیوں آدمی کمزور ہے اتنا
پگھل جاتا ہے دستِ اہرمن میں موم کی صورت

۱۹۷۱ء

فن کار کا منصب

سرزمیں کون سی مقتل بنی ؟
کس تیغ کا جوہر چمکا ؟
یہی موضوعِ سخن ہے ابھی فرزانوں کا
جہدِ باہم سے گریزاں ہیں اُجالوں کے سفیر
کون بک جائے
کہاں، کس کے اشارے پہ ابھی
یہی معلوم نہیں
صبح کا شام سے یارانہ ہوا
امن و سکوں، رات کا افسانہ ہوا
رہ گیا پردۂ تاریک میں سورج تنہا
مٹ گئے سب در و دیوارِ خُمستاں کے نقوش !
غم کی تشہیر سہی لطف و کرم کیا معنی ؟

سرد آہوں کو دبا لو کہ اندھیرے ان کو
اپنی تفریح کا سامان بنا لیتے ہیں
اب تو ہر نوکِ سناں ، نوکِ سناں چاہتی ہے
صحنِ گلشن میں صبا
سایۂ خنجر میں تفنگ
بات اتنی سی ہے
اشکوں سے پگھلتا نہیں سنگ
حُسن ڈھلتا ہے مشینوں میں نہ پیمانوں میں
صورتِ خوں ہے رواں وقت کی شریانوں میں
تم تو فن کار ہو
فن
شاخِ گل تر ہی نہیں
تیغِ جگر دار بھی ہے
ہاتھ یوں دامنِ قاتل کو پہنچتا کب ہے
جراءتِ دل جو نہیں جامہ دری کیا ہو گی
کوہکن بن نہ سکے
شیشہ گری کیا ہو گی

۶۱۹۷۱

ایک منظر

زمیں کی طرح فلک بھی بہت اُداس ہے آج
جھکا ہے خاک نشینوں پہ آسماں کی طرح

اب اُن کی آنکھوں میں وہ تابشِ جمال کہاں
خموش رہتی ہیں ویران آشیاں کی طرح

کہاں وہ صیقل آئینہ اب کہ دیکھ سکیں
بنائے پھرتے ہیں صورت وہ نوحہ خواں کی طرح

اُڑی اُڑی سی ہے رنگت، بجھی بجھی سی نگاہ
نظر اب آئی ہے شاید خزاں، خزاں کی طرح

ستم رسیدہ بنے پھر رہے ہیں اہلِ ستم
کسی سے ملتے بھی اب ہیں تو بے زباں کی طرح

ہے دیدنی شبِ غم اُن کی بے کسی لوگو!
گئی وہ بات کہ پھرتے تھے کہکشاں کی طرح

۶۱۹۶۷

قصیدہ باہنوں کی مچھلیوں کا

سفید پوشی
سیاہ کاری
دروغ گوئی
ستم شعاری
یہ سارے الفاظ ایک ہی خاندان کے ہیں
ستارے یوں جیسے ساتویں آسمان کے ہیں

بزعم خود تاجدار ہیں یہ
بزورِ شمشیر صحنِ گلشن میں صاحبِ اختیار ہیں یہ
نقیبِ فصلِ بہار ہیں یہ
کجیٔ دیوارِ ظلم سے فکر مند بھی ہیں
اگرچہ سب سے بلند بھی ہیں
زمیں نے بدلا ہے رنگ جب سے
مزاجِ ہستی بدل گیا ہے

خودی کے سانچے میں ڈھل گیا ہے
درخت برگد کے سال خوردہ، زمیں سے معدوم ہو چکے ہیں
جو بچ گئے ہیں وہ اپنے سائے سے آپ محروم ہو چکے ہیں
پرانی شاخیں نئی ہواؤں کے زور سے ٹوٹنے لگی ہیں
ہر ایک شاخِ حیات میں کونپلیں گھنی پھوٹنے لگی ہیں
چراغِ اہلِ حریر و کمخواب آخری سانس لے رہا ہے
ہزار ارزاں ہو خونِ انساں
جبینِ رنج و محن سے جس دم یہ پھوٹتا ہے
تو اس کی موجوں میں ڈوب جاتے ہیں
تخت و تاج و صلیب و خنجر
اسی کو کہتے ہیں روزِ محشر
بدل چکے ہیں پرانے الفاظ کے معانی
نہیں کوئی چیز جاودانی
قلم کی بھی ہے نئی کہانی
قلم جو رشکِ ہلال بھی ہے
قلم جو اکثر کدال بھی ہے
جلال بھی ہے جمال بھی ہے
کما رہا ہے خود اپنی روزی
نہ گل فروشی نہ خانہ سوزی

ہوس کے بندوں کی مہربانی
ہے یوں ہی جیسے نچوڑ کر کوئی آدمی کو
چھڑک دے لاشے پہ اس کے دو چار بوند پانی

فریب ہے ان کی پاسبانی
حصارِ سنگیں میں بے بسی کا شکار ہے حسنِ شعلہ پیکر
طلوعِ خورشید ہے شعارِ جبینِ آدم کی سرفرازی
غریب ہے وہ کہ جس کی آنکھوں سے کوئی شعلہ نہیں لپکتا
غریب ہے وہ کہ جس کی باہوں میں زندگی کی تڑپ نہیں ہے
نگاہِ بیدار کی اک انگڑائی حریّت کا پیام بن کر
تمام عالم پہ چھا گئی ہے
ہر ایک نقشِ سیہ کو یکسر مٹا گئی ہے
لہو کے دریا میں معتبر ہے کوئی تو باہوں کی مچھلیاں ہیں
یہی حقیقت میں بجلیاں ہیں
تڑپ میں ان کی کبھی کبھی روشنی کی صدیاں سمٹ گئی ہیں
ہزاروں زنجیریں کٹ گئی ہیں
تمام دنیا یقینِ محکم کی داستاں ہے
علاوہ اس کے ہر ایک شے گردِ کارواں ہے

۱۹۷۲ء

سانیٹ

غم کی دُنیا میں ہے ہر شخص پریشاں تنہا
وسعتِ زیست غم و یاس کا صحرا ٹھہری
فرصتِ پرسشِ احوال بھی عنقا ٹھہری
درد کی چھاؤں گھنی ہے مگر انساں تنہا

جس طرف دیکھئے قدروں کے کھنڈر ملتے ہیں
جسم ملبوں میں دبے، قید میں روحیں بیتاب
سر پہ انگارہ ہے اور دُور نگاہوں میں سراب
سسکیاں جن میں مکیں ہوں وہی گھر ملتے ہیں

اب کہاں کشتۂ احساس کوئی ہوش میں ہے
خوفِ شمشیرِ برہنہ سے ہے سہمی ہوئی یاد
بے گناہوں پہ ہیں پابندیاں، قاتل آزاد
زندگی سمٹی ہوئی موت کی آغوش میں ہے

مُنصفی جانبِ قاتل ہے، دِوانہ چُپ ہے
سنگ کی طرح زمانے کا زمانہ چُپ ہے

۱۹۷۲ء

سانیٹ

گُل پشیماں، خاروخس افزوں، فضا طوفاں بدوش
غنچے افسردہ، نظر حیراں، صبا بے دست و پا
آرزو سہمی ہوئی، اُجڑا ہوا نخلِ وفا
تشنگی حد سے بڑھی، جاتا رہا جوش و خروش

راکبِ اسپِ زمانہ گر کے خود مرکب ہوا
جہدِ پیہم، صیدِ مجبوری ہے، صحرائے کنار
ہجر کے بیمار کا کوئی نہیں تیماردار
جوہرِ مہر و وفا بھی ہم کنارِ شب ہوا

اس کشاکش میں بہت ہے فرصتِ یک دو نفس
حوصلہ دار و رسن کا ہو اگر دل میں جواں
سینۂ بسمل سے اُٹھتی ہے صدائے کن فکاں
نزع کے عالم میں جیسے آئے آوازِ جرس

آج بھی چاہے تو تخلیقِ سحر مشکل نہیں
آدمی قائل ہے خود اپنا کوئی قاتل نہیں

۱۹۷۲ء

سانیٹ

آپ میں سمٹے ہوئے افلاک پر چھائے ہوئے
اس جنونِ شعلہ ساماں کا عجب انداز ہے
تا ہماں برباد ہو کر بھی فلک پرواز ہے
سر بکف آخر ہوئے قسمت کے ٹھکرائے ہوئے

ہر ادائے سرفروشی سے نمایاں انتباہ
زخم سے رِستا ہے خوں، خورشید سے جیسے شفق
خوف سے چہرہ اندھیرے کا ہوا جاتا ہے فق
سینہ چھلنی ہے مگر شانِ عقابی بے پناہ

کہتے ہیں اہلِ جنوں کب تک یوں ہی دیکھا کریں
بے سرو ساماں، وطن سے دُور، کیا عالم نہیں
منصفو! پھر کیوں ہمارے حال پر ماتم نہیں
متّحد ہیں دشمنانِ جان و دل ہم کیا کریں

شدّتِ رنج و الم کا یہ بھی اک انجام ہے
سرفروشی کامراں ہے زرگری ناکام ہے

۱۹۷۲ء

سانیٹ

حریر و پرنیاں محفوظ ہیں تار قبا میرا
ہے محتاجِ رفو، کب باغبانوں کو ترس آیا
گلوں کی چاک دامانی کا قصہ یوں ہی بس آیا
ملے کیا جانے کس بوالہوس کو خوں بہا آیا

شکستہ جام و مینا، خمُ بہ اندازِ حریفانہ
کہاں وہ شامِ میخانہ کہاں یہ شامِ محرومی
نفاقِ مذہب و ملّت، فسادِ ہندی و رومی
کوئی ملتا نہ تھا شاید انہیں عنوانِ افسانہ

چمن میں شکوۂ تخریبِ گلچیں عام ہے گویا
کوئی بسمل کبھی اس راہ میں تنہا نہیں ہوتا
مگر قطرہ الگ رہ کر کبھی دریا نہیں ہوتا
فروغِ تیرہ بختی بے حسی کا نام ہے گویا

کہاں ہے اب کوئی جو قصۂ جورِ بتاں لکھے
لہو سے آج خود اپنے لہو کی داستاں لکھے

۱۹۷۲ء

سانیٹ

اندھیری رات میں بے دست و پا ہے تنہائی
نظر میں کچھ بھی نہیں سایۂ نظر کے سوا
نہیں ہے فکر کسی کی اک اپنے گھر کے سوا
خزاں رسیدہ ہوئی زندگی کی پہنائی

سمٹ گئے ہیں اُجالے بھٹک رہی ہے نظر
مرے خیال کا سُورج بھی مضمحل سا ہے
سیاہ رات کے دامن میں کچھ خجل سا ہے
نہ راہبر پہ بھروسہ رہا نہ ذوقِ سفر

ہے تار تار قبائے خرد، جنوں خاموش
چمن میں دشت کا عالم ہے مستعد رہزن
قدم قدم پہ ہے احساسِ بے کسی کی چُبھن
نہ ہو سکی کوئی تنویرِ آرزو گُل پوش

بہارِ ہستی بجز سعئِ بے کنار نہیں
میں سوچتا ہوں کوئی کیوں حریفِ دار نہیں

۱۹۷۲ء

غزلیں

○

خوابوں کی کلیاں چٹکی ہیں پھر غم کے ویرانے میں
خونِ جگر سے رنگ بھریں ہم اب کس کس افسانے میں

خُم کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے، ہم نے تو اس میخانے میں
سُورج کی کرنیں دیکھی ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

شمع تو ہے تنویر سراپا ، سوزِ محبت کیا جانے
شُعلہ سا اک ناچ رہا تھا پیہم خود پروانے میں

زخموں کی شادابی گویا ہونٹوں کی مجبوری ہے
کتنے ٹانکے ٹوٹ گئے اک رنگِ تبسّم لانے میں

وعدوں کی صہبا بالآخر ٹپ کے ہوئی زہراب انیسؔ
دیکھوں اب کے کیا بھرتا ہے ساقی مرے پیمانے میں

۱۹۷۰ء

○

یہ دامنِ قاتل ہے کہ اپنی ہی قبا ہے
میں سوچ رہا ہوں کہ مرے ہاتھ میں کیا ہے

دُکھ درد کو مل بانٹ کے جینے کا سلیقہ
لگتا ہے کہ ہر آدمی اب بھول چکا ہے

جس سمت نظر اُٹھتی ہے ویرانہ ہے گویا
صحرا مری گستاخ نگاہی کی سزا ہے

اُجڑی ہوئی بستی میں کہاں سایۂ دیوار
قاتل مرا ملبے پہ کھڑا ہانپ رہا ہے

دیوانوں کو نقصان کی پروا نہیں ہوتی
دشمن ہے زمانہ تو انیس آپ کو کیا ہے

۱۹۷۰ء

○

نگاہِ ناز کی قسمت پہ یوں نہ اِترائیں
مقامِ رشک ہے زخموں کو دیکھتے جائیں

کڑی ہے دھوپ زمیں تپ رہی ہے پاؤں ہیں شل
یہاں سے لوٹ کے جائیں تو ہم کہاں جائیں

گذر گئی دلِ محزوں سے ہو کے یادِ بہار
کہاں سے اب کوئی احساسِ رنگ و بو لائیں

بہت قریب ہے منزل وصالِ جاناں کی
یہ بات سچ ہی سہی دل کو کیسے سمجھائیں

عجیب بات ہے بدلا ہے آسماں جب سے
بدل گئی ہیں اُجالوں کے باب میں رائیں

انیسؔ آؤ کریدیں خود اپنے سینوں کو
لہو سے تر کریں دامن خزاں کو شرمائیں

۱۹۶۷ء

○

ستم نصیب رہا عمر رائیگاں گذری
کبھی کبھی تو خوشی بھی بہت گراں گذری

متاعِ کشمکشِ انتظار تھی وہ گھڑی
ترے بغیر جو غیروں کے درمیاں گذری

روش روش پہ لُٹی صحنِ گلستاں میں بہار
بدل بدل کے قبائے حسیں خزاں گذری

انیسؔ سنتے ہیں اب کے چمن سے ہو کے بہار
ستارے ڈوب رہے تھے کہ ناگہاں گذری

۱۹۵۷ء

○

آج کی شام مجھے پھر تری یاد آئی ہے
پھر وہی غم ہے وہی عالمِ تنہائی ہے

مہکی مہکی سی فضائیں ہیں گھٹا چھائی ہے
پھر تری زلف کہیں بام پہ لہرائی ہے

سُرخیِ خوں سے بھی گہرا ہے تری یاد کا رنگ
جانے کس راہ سے ہو کر تری یاد آئی ہے

دل کی وادی میں مہک اُٹھے ہیں زخموں کے گلاب
یاد آئی ہے تری یہ کہ بہار آئی ہے

میرے قدموں میں جھکا آتا ہے سورج ناحق
ایک دُنیا مری وحشت کی تماشائی ہے

پردۂ سازِ غزل میں ہیں خود اپنی باتیں
یہ بھی کیا خوب انیسؔ انجمن آرائی ہے

۱۹۵۵ء

○

زندگی ہے شیشہ و تیشہ کے ٹکرانے کا نام
موت ہے شیشے کے چکنا چور ہو جانے کا نام
آرزو ہے وادیٔ دل میں خرامِ بوئے گل
عزم ہے تلوار کے سانچے میں ڈھل جانے کا نام
غمزہ مژگانِ بُتِ کمسن کے جھکنے کی ادا
ناز سب کچھ جان کر انجان بن جانے کا نام
لطفِ اظہارِ تمنّا پر کسی کا لفظ ہاں
ظلم وعدہ کر کے وعدے سے مکر جانے کا نام
درد ہے کہسار کے سینے میں لاوے کا خروش
ضبط ہے طوفان کے پلکوں پہ ٹھہرانے کا نام
میں کچھ ایسا بھی نہ تھا بیگانۂ عقل و شعور
دے دیا لوگوں نے ناحق مجھ کو دیوانے کا نام
پھر انیسؔ اُن کی نگاہِ ناز ہے مائل بہ لطف
پھر نہ دُہرانا پڑے شیشے کا پیمانے کا نام

۱۹۵۷ء

○

دھواں دھواں ہے سحر شامِ پُر الم کی طرح
دراز ہے مرا سایہ بھی میرے غم کی طرح

ہر آدمی ستمِ ناروا کے سائے میں
پڑا ہے فرش پہ ٹوٹے ہوئے قلم کی طرح

گئی نہ دُور کبھی حلقۂ غرض سے نگاہ
طواف کرتی رہی طائرِ حرم کی طرح

بُجھی بُجھی ہی سہی میری زندگی پھر بھی
فرازِ دار پہ چھائی ہے شامِ غم کی طرح

خلوصِ دل سے پکارے بھی کوئی مجھ کو انیسؔ
وفا کی راہ میں بچھ جاؤں میں عدم کی طرح

۱۹۶۷ء

○

زہر کے دانت گلشن میں بوئے گئے اور سنپولوں کی فصلیں اُگائی گئیں
آپ جب سے ہوئے پاسبانِ چمن دھجیاں فصلِ گل کی اُڑائی گئیں

ہم نے چاہا گلوں کو ملے رنگ و بو خواہ کانٹوں کو شبنم ملے یا لہو
بات اتنی سی تھی بڑھ گیا ہائے وہ تہمتیں ہم پہ کیا کیا لگائی گئیں

رات کو رات کہنا غضب ہو گیا شام کو صبح کہنے پہ عہدے ملے
دست و پا بے گناہوں کے جکڑے گئے برسیاں قاتلوں کی منائی گئیں

شمعِ افکار سے رات کا تھا زیاں، بس اسی واسطے ہم سے ہیں بدگماں
بدلیوں سے سجائی گئیں آندھیاں بجلیاں چشم و دل پر گرائی گئیں

وہ چلایا کریں ہم پہ تیغ و تبر، ہم نے بھی طوق سے ڈھال لی ہے سپر
رقصِ پیہم سے خود بن گئیں کہکشاں، جتنی زنجیریں ہم کو پہنائی گئیں

اور کیا چاہیے تھا انیسؔ آخرش ظلمتِ شب کی پوری وصیّت ہوئی
غسلِ میّت سحر نے دیا اِس طرف، اُس طرف ساری شمعیں جلائی گئیں

۱۹۶۲ء

○

دشمنِ قلب و نظر کو دل رُبا کہتے بھی کیا
ہم اندھیرے کو اندھیرے کے سوا کہتے بھی کیا

تشنگی سے ہے بہت اونچا مذاقِ مے کشی
تشنگانِ حسن تجھ سے ساقیا! کہتے بھی کیا

کیسی حق گوئی، کہاں کا عدل، کس کا اعتبار
مصلحت بینوں سے دل کا مدعا کہتے بھی کیا

اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں لُٹ گئے ہم اہلِ دل
کون مجرم ہے کسی سے بر ملا کہتے بھی کیا

کیسی باتیں کر رہے ہو کھُل نہ جاتا رازِ حُسن
خوش نگاہی کو مری وہ آئینہ کہتے بھی کیا

۱۹۶۹ء

○

تلاشِ حسن میں ظلمت کدوں سے ہو آئے
لہو تو جل ہی چکا تھا دیا بھی کھو آئے

ملا نہ کچھ صلۂ جاں سپاریٔ احباب
حضورِ حسن وہ آخر لہو بھی رو آئے

معاف میں نے کیا خوں بہائے دل اپنا
کہو یہ اُس سے کہ دامن تو پہلے دھو آئے

اُگے اُگے نہ اُگے نخلِ آفتاب کوئی
زمینِ شور میں دل ہم تو اپنا بو آئے

شراب سے کوئی غم کب غلط ہوا ہے انیس
کسی کے کہنے پہ بس میکدے سے ہو آئے

۱۹۶۸ء

○

کوئی بتائے کہ احساسِ زندگی کیا ہے
جو میں نہیں تو مرے ہونے کی خوشی کیا ہے
ستمِ گردوں کی ستائش برائے یک دو نفس
یہی حیات ہے لوگو! تو خودکشی کیا ہے
ستم شعاریٔ گلچین و باغباں پہ نہ جا
وفا شعاریٔ موجِ بہار بھی کیا ہے
متاعِ دیدہ و دل یوں ہی کچھ نہیں ملتی
سُلگ اُٹھے جو نہ غم سے تو آدمی کیا ہے
مشامِ جاں سے جو ٹپکے تو پھول کھِل اُٹھیں
لہو کی ورنہ زمانے میں قدر ہی کیا ہے
ہر انقلاب یہیں سے شروع ہوتا ہے
کسے بتاؤں کہ انجامِ تشنگی کیا ہے
نشاطِ سعیٔ مسلسل تلاشِ منزلِ شوق
سوائے اس کے مری اور زندگی کیا ہے

۱۹۶۸ء

○

حدیثِ بزمِ محبت سُنا رہا ہوں ابھی
مقامِ تشنہ لبی ہے مقامِ تشنہ لبی
حضورِ حسن ہوئی مجھ سے یہ بھی بے ادبی
نظر بچا کے رقیبوں سے گفتگو کرلی

نکل گئی بہت آگے وفا کی منزل سے
کئے ہے اُن کو بھی حیراں مری جفا طلبی
نظر بُجھی تو ہوئی شمعِ جستجو روشن
پیامِ جلوۂ نو ہے کمال تیرہ شبی

وہ شے جو قُلقُلِ مینا ہی سے عبارت ہے
کہاں سے لائے گی وہ شے صدائے جام تہی
جُھلس رہا ہوں میں اپنے ہی غم کے صحرا میں
بلائے جاں ہے مرے سر پہ آفتاب خودی
مجالِ عذر کہاں تیرے نکتہ چینوں کو
انیسؔ ہوگئی تجھ پر تمام نکتہ رسی

۱۹۶۶ء

○

بادہ کم ہے نہ تشنگی کم ہے
میکدے کا عجیب عالم ہے

خوں چراغوں میں جل رہا ہے مرا
پھر بھی کہا ہے کہ روشنی کم ہے

رات کو رات بھی کہے نہ کوئی
تیرگی کا مزاج برہم ہے

رہنے دیجئے بھی لطف فرمائی
آپ کی بے رُخی ہی کیا کم ہے

گُل بھی کر دے کوئی چراغِ وفا
میں بھی کہتا ہوں روشنی کم ہے

کوئی سمجھا نہ میری بات انیسؔ
مجھ کو غم ہے تو اک یہی غم ہے

۱۹۶۷ء

○

ہمارے ساقی نے کس حسنِ اہتمام کے ساتھ
سحر کو باندھ کے رکھا ہے اپنی شام کے ساتھ

کچھ اور جب سرِ مقتل نہ بن پڑا اُن سے
خطائیں جوڑ دیں غیروں کی میرے نام کے ساتھ

حریفِ نغمۂ آہن گداز کیسا ہوتا
وہ دل جو ڈوب گیا خود شکستِ جام کے ساتھ

لکھا ہے جشنِ بہاراں ہر ایک شیشے پر
بندھی ہے شرطِ غلامی ہر ایک جام کے ساتھ

خودی نے کام بگاڑے سبھی بُرا ہو انیسؔ
لیا جو نام بھی اُن کا تو اپنے نام کے ساتھ

۱۹۶۵ء

○

جب بھی کی ہم نے تزئینِ صحنِ چمن
پڑ گئی باغباں کی جبیں پر شکن

کیا نسیمِ سحر، کیا شبابِ چمن
قطرۂ خونِ دل رشکِ صد انجمن

اب کہاں چھپ گئے قاتلانِ چمن
دوش پر ہم لئے پھر رہے ہیں کفن

زندگی کو مری اے اسیرانِ غم
کر گئی بیکراں قیدِ دار و رسن

یہ تعلّی نہیں واقعہ ہے انیسؔ
میری ایجاد ہے میرا طرزِ سخن

۱۹۶۰ء

○

رگ و پے میں زہر اُتر گیا، مری آنکھ ان کو ترس گئی
مری زندگی بھی عجیب ہے نہ خوشی ملی نہ ہوس گئی

تری یاد بھی ہے عجیب شے، کبھی جانفزا، کبھی جانگسل
کبھی بس گئی مری روح میں کبھی دل کو چپکے سے ڈس گئی

ستم فلک کو میں کیا کہوں وہ کلی کہ کہتے ہیں دل جسے
ابھی اک پہر بھی ڈھلا نہ تھا کہ ہجوم غم سے بکس گئی

میں اسیر کنج آنا رہا، غم دو جہاں میں گھرا رہا
نہ خزاں ہی کر سکی حوصلہ نہ بہار سوئے قفس گئی

مری درسگاہ عمل بھی اب، ہے سکوت شام کی ہم نوا
وہ جو تھی محرک زندگی وہ ادا بھی اب کے برس گئی

۱۹۶۹ء

○

میرے زخموں پہ ترس کب اُسے آیا ہوگا
شاخِ گل جان کے بانہوں سے وہ لپٹا ہوگا

ریگزاروں میں کوئی پھول کہاں کھلتا ہے
کسی دیوانے کا وہ نقشِ کفِ پا ہوگا

سامنے تیرگی پھیلائے ہے دامن اپنا
میری ہی پشت پہ سورج کوئی ڈوبا ہوگا

دل کی دہلیز پہ پھر یادوں کے مہماں آئے
پھر مجھے دل کے مکینوں سے اُلجھنا ہوگا

زندگی بیت گئی موت کا دھوکا کھاتے
اس سے بڑھ کر بھی انیسؔ اب کوئی دھوکا ہوگا

۱۹۶۸ء

○

خودی کا قحط ہے کچھ تو خودی کی قدر کرو
چراغ کی نہ سہی روشنی کی قدر کرو

نظر وسیع کرو دل کا آئینہ چمکاؤ
بھٹک نہ جائے کہیں آدمی کی قدر کرو

اسی سے آج بھی قائم ہے شرمِ مے خانہ
جو ہو سکے تو مری تشنگی کی قدر کرو

اُلجھ رہا ہوں بگولوں سے فصلِ گل کے لئے
مری وفا، مری دیوانگی کی قدر کرو

پیامِ جہدِ مسلسل ہے شاعری میری
سخن شناسو! مری شاعری کی قدر کرو

۱۹۶۸ء

○

چھلنی ہے زخموں سے سینہ کس سے دلِ بیمار کہے
کس حصّے کو روزن سمجھے کس کو اب دیوار کہے

درد کی یورش حد سے سوا ہے غم کا مداوا کوئی نہیں
اپنی اپنی سب کو پڑی ہے کس کو کوئی غم خوار کہے

نوکِ سناں سے بات چلی ہے نوکِ سناں تک پہنچے گی
چاہے اس کو دنیا میری جیت کہے یا ہار کہے

طوفانوں میں دل کا سفینہ جگمگ جگمگ جیسے نگینہ
ہم کیا عرضِ حال کریں کچھ خود اس کو منجدھار کہے

دل کے پار اُتر جاتے ہیں ذہنوں کو اُکساتے ہیں
تم نے انیسؔ آخر اس جگ میں کیوں ایسے اشعار کہے

۱۹۷۰ء

○

جاں گسل گرچہ مری بے خبری ہوتی ہے
اِس میں کچھ ان کی بھی افسوں نظری ہوتی ہے

جامِ زہراب پہ ہوتا ہے گمانِ مے ناب
میرے ساقی کی بھی کیا عشوہ گری ہوتی ہے

دل اُمنگوں کے اشارے پہ جواں ہوتا ہے
شاخِ غم، خونِ تمنّا سے ہری ہوتی ہے

فیض گستر ہوئی بیداریٔ احساسِ حیات
میرے بالیں پہ نسیمِ سحری ہوتی ہے

۱۹۶۹ء

○

رہی نہ زندگی اب میری زندگی کی طرح
سمٹ گیا ہوں میں جنگل میں روشنی کی طرح

چمک اُٹھی ہے سپیدی سے گھر کی ویرانی
روپہلی رات میں صحرائے بے کسی کی طرح

گیا جو پرسشِ ہمسایہ کو تو غم ہی ہوا
کھڑا رہا وہ دریچے پہ اجنبی کی طرح

خلوص نام فریبِ خلوص کا ہے انیسؔ
ملا نہ مجھ سے کوئی شخص آدمی کی طرح

۱۹۷۱ء

○

لذّتِ سایۂ دیوار نے مارا ہم کو
باعثِ ننگ ہے منزل کا سہارا ہم کو

پھر سرِ دشتِ ستم کس نے پکارا ہم کو
ڈھونڈتا ہو نہ کوئی درد کا مارا ہم کو

کس کو سمجھائیں حیاتِ ابدی کا مفہوم
کھینچ لایا ہے وہ مقتل میں دوبارا ہم کو

جلوے کو برہمیِ حسن تھی لازم جو نہیں
شوق نے عرضِ تمنّا پہ اُبھارا ہم کو

۱۹۷۰ء

ذکر مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں

سودا

ذکرِ جورِ رسن و دار کروں یا نہ کروں
خود کو شرمندۂ گفتار کروں یا نہ کروں

جذبۂ دل سے مرے دست وگریباں ہے خودی
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں

پھر جنوں خیز ہوئی جاتی ہے وحشت میری
جذبۂ عشق کا اظہار کروں یا نہ کروں

خامشی بھی ہے غضب، پیرہن گل بھی عزیز
دامنِ دل کو شرربار کروں یا نہ کروں

ظلم گو حد سے سوا ہے مگر اے جانِ عزیز
اس کو رسواسرِ بازار کروں یا نہ کروں

۱۹۵۲ء

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

اقبالؔ

بات وہ اب کہاں رہی حُسن کے التفات میں
عشق بھی ہو چلا ہے گم اپنی ہی کیفیات میں
چاہیئے اب اُسے تو کیوں، ڈھونڈیئے بھی تو کس لئے
اپنی ہی جب خبر نہیں عالم حادثات میں
گوہرِ شاہوار ہے قطرۂ خوں بہ فیضِ شوق
گرمیٔ شوق کے بغیر لطف نہیں حیات میں
موت نہیں تو زندگی جہد و عمل سے بے خبر
جہد و عمل سے زندگی کارگہِ حیات میں
رنگ ہے دل کشی نہیں شعلہ ہے روشنی نہیں
میں جو نہیں تو کچھ نہیں عالمِ بے ثبات میں
شعلۂ آرزو ہے دل، منبعِ ہائے و ہو ہے دل
مرکزِ رنگ و بو ہے دل وسعتِ کائنات میں
ہم ہی نہ جب بدل سکے شکوہ کسی سے کیا انیسؔ
کوئی گرہ تو ڈالئے سلکِ تغیّرات میں۔

۱۹۵۸ء

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

غالبؔ

○

کس کو آنا تھا یہاں رشکِ گلستاں ہونا
ہم نے ہی گل کو سکھایا ہے زرافشاں ہونا

وعدہ وصل ہے پھر سر کے عوض کیا کہیے
آج بھی مجھ کو ہے مقتل میں غزل خواں ہونا

حسن سے گرچہ نہیں ترکِ تعلّق مقصود
مجھ کو لیکن ہے حریفِ غمِ دوراں ہونا

سینۂ غنچہ میں خوشبو ہے عدم کی صورت
نالۂ دل کا مقدّر ہے پریشاں ہونا

تیلیوں پر جو بھروسہ ہے قفس کو تو ہمیں
ناز اس پر ہے کہ آنا جو پرافشاں ہونا

ہم چراغِ رہِ فردا ہیں ازل ہی سے انیسؔ
ہم کو آتا نہیں ظلمت سے ہراساں ہونا

مومنؔ

○

آئے تھے کوئے یار میں یوں اپنے جی سے ہم
کیا جانتے تھے پھر نہ ملیں گے کسی سے ہم

ہوش آ گیا جو کھائی محبّت میں دل پہ چوٹ
نا آشنا تھے رسم و رہِ زندگی سے ہم

للہ ہم پہ یوں نہ کریں چشمِ التفات
بیزار اس قدر بھی نہیں زندگی سے ہم

تم اور اپنے چاہنے والوں سے ہو خفا
کہہ دو کہ بات بھی نہ کریں اب کسی سے ہم

ڈرتا ہے جی کہ اپنا مخاطب نہ ہو رقیب
دل کی کہیں انیسؔ تو کس آدمی سے ہم

۱۹۵۹ء

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

غالب

ملنے کا جو اُس شوخ کے ہوتا کوئی دن اور
کرتے نہ ابھی جان کا سودا کوئی دن اور

بے وجہ نہیں نیرگیٔ شامِ گلستاں
لگنے کو مرے دل پہ ہے چرکا کوئی دن اور

ہر چند گنہگارِ خودی ہوں گے سرِ دار
کر لیتے ہیں گلگشتِ تمنّا کوئی دن اور

پی لیتے ہیں مل جاتی ہے جو بھی سرِ محفل
رکھ لیتے ہیں شرمِ مے و مینا کوئی دن اور

یہ مرثیہ اپنا ہے انیسؔ اپنے قلم سے
لکھنا ہے ابھی مرثیہ اپنا کوئی دن اور

۱۹۵۹ء

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
غالِبؔ

○

رنگ پھیکا کفِ قاتل کا ہوا میرے بعد
خونِ دل کو مرے روتی ہے حنا میرے بعد

اب کہاں وہ نگہہ و دل جو سنوارے اُن کو
حسن منّت کش آئینہ ہوا میرے بعد

تیرگی بزم نشینوں کا مقدّر ٹھہری
کوئی بھی شمع کی صورت نہ جلا میرے بعد

پھر کوئی کشتی نہ ٹوٹی نہ کوئی دل ڈوبا
سو گیا چین سے طوفانِ بلا میرے بعد

کھُل گیا رازِ وفا۔ بوالہوسی کے صدقے
ہو گئے وہ بھی رقیبوں سے خفا میرے بعد

ذوقِ نظارہ ہوا دفن مرے ساتھ انیسؔ
حُسن بھی شرم سے پردے میں چھپا میرے بعد

۱۹۶۹ء

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک

غالبؔ

کیا بھروسہ ترے جلوؤں کا سحر ہونے تک
رنگ اُڑ جائے نہ تسکینِ نظر ہونے تک

شام چاہے ہے مرے خونِ جگر کی سُرخی
رات کہتی ہے کہ سمجھیں گے سحر ہونے تک

خواہشِ مرگ سے جاتی نہیں بے تابئ دل
ضبط درکار ہے دیوار میں در ہونے تک

بیٹھ رہنے سے سمٹتا نہیں صحرائے حیات
جستجو شرط ہے منزل کی خبر ہونے تک

پیکرِ خواب ہی پتھّر سے تراشو لوگو!
کچھ تو کرنا ہے بہرحال سحر ہونے تک

بعد مدّت کے یہ جانا کہ زمانے میں انیسؔ
سارے آلام ہیں بس سینہ سپر ہونے تک

۱۹۶۹ء

○

کہہ دو اسے دیوانوں سے الجھا نہیں کرتے
ہم اہلِ جنوں موت کی پروا نہیں کرتے

چپ دیکھ کے ہم کو وہ یہ سمجھے کہ نہیں یاد
ہم ہیں کہ سرِ راہ تقاضا نہیں کرتے

خود سایہ کیے پھرتی ہے گردِ رہِ منزل
رہرو کبھی سائے کی تمنّا نہیں کرتے

واماندگی مجبور کیے دیتی ہے ورنہ
ہم مُڑ کے کبھی راہ میں دیکھا نہیں کرتے

مقتل میں یہ بے باکی انیس آج کے جگ میں
جی! ہم تو کہیں گے یہی اچھا نہیں کرتے

۱۹۶۹ء

○

آواز دوں کسے کوئی سُنتا بھی ہے کہاں
میں چیختا رہا ہوں چٹانوں کے درمیاں

گونگوں کی بستیاں ہیں کوئی بولتا نہیں
ڈر ہے کہ ہو نہ جاؤں کہیں میں بھی بے زباں

گمراہیوں کی بِھیڑ میں چپکا کھڑا ہوں میں
اس اجنبی سے شہر کا تنہا ہوں راز داں

ناقدریٔ بہار کا سارا قصور ہے
میں ورنہ کب چمن میں ہوا اتنا شرر فشاں

سورج ہوں میں نہ پوچھ طلوع و غروب کو
آغوش میں لئے ہے مجھے رات کی کماں

فرصت کے ساتھ ضبط کا یارا بھی چاہیئے
سُنتا ہے کون میرے مقدّر کی داستاں

حاجت ہو جس کو میری، نکالے کرید کر
خاکسترِ چمن میں ہوں مثلِ شرر نہاں

منزل برائے شوق ہے سایہ برائے تام
اے راہرو نہ بھول کہ ہستی ہے بے کراں

اشکوں سے کب چراغ جلا ہے کہ روئیں ہم
خونِ دل و جگر سے ہے برفِ نظر تپاں

تنصیب ظلم و جور سے ہوتا نہیں ہے کم
میرا جنوں ہے خالقِ تقدیرِ دو جہاں

حدِّ نظر سے شوق کو کیا واسطہ انیسؔ
منزل تو زیرِ پائے جنوں رہتی ہے نہاں

۱۹۷۲ء

بیگانۂ احساسِ خودی ہے دُنیا
اک جلوہ گہہِ خود غرضی ہے دُنیا
کِرنوں کے لئے آج بھی خورشید کے گِرد
بند آنکھیں کئے ناچ رہی ہے دُنیا

●

پوچھے ہے سرِ راہ زمانہ ہم سے
بھٹکی ہوئی روحوں کا ٹھکانہ ہم سے
ہم خضر نہیں پھر بھی حقیقت یہ ہے
وابستہ ہے دُنیا کا فسانہ ہم سے

●

خوشیاں ہیں کہ اُڑتی ہوئی خوشبو جیسے
غم دھونی رمائے کوئی سادھو جیسے
ملتی ہی نہیں گردشِ پیہم سے نجات
ہستی ہے کہ بنگال کا جادو جیسے

غنچوں کے تبسّم سے سبق لیتے ہیں
میخانے میں ہم خُم سے سبق لیتے ہیں
موجیں ہمیں سکھلائیں گی کیا کچھ ہم تو
دریا کے تلاطم سے سبق لیتے ہیں

●

لوگو! کبھی واعظ کو بھی اچھّا کہہ دو
کیا حرج ہے اس میں جو مسیحا کہہ دو
ٹھہرے ہوئے پانی کو شکایت ہوگی
اک بار تو تالاب کو دریا کہہ دو

●

ٹوٹا ہوا اک جام اُٹھا لایا ہوں
مے نوشی کا الزام اُٹھا لایا ہوں
مے خانۂ وحدت سے بزمِ ہستی
بارِ غمِ ایّام اُٹھا لایا ہوں

یہ رسم نہیں کچھ یوں ہی یہ دُنیا ساقی
کرتا ہے ہمیں کس لئے رُسوا ساقی
انصاف سے کہہ دے کہ ترے ساغر میں
خوننابِ ہمارا ہے کہ صہبا ساقی

●

صہبائے خودی مجھ کو پلا دے ساقی
ہاں! جلوۂ نادیدہ دکھا دے ساقی
چکّھی ہوئی صہبا سے تو بہتر یہ ہے
محفل ہی سے تو مجھ کو اُٹھا دے ساقی

●

خواہش تھی یہی اس کا سراپا دیکھوں
ہوں قطرہ مگر قطرے میں دریا دیکھوں
آئینۂ دل بھی تو ہے ریزہ ریزہ
اب خود کو بھی دیکھوں تو بھلا کیا دیکھوں

ہستی کو مری رنج والم نے لُوٹا
کب اس کی گھنی چھاؤں سے پیچھا چھُوٹا
ہر بار نئی کونپلیں پھوٹیں اک ساتھ
پتّا جو کوئی غم کے شجر سے ٹوٹا

●

غاروں سے جو نکلا تو یہاں تک پہنچا
دھرتی سے اُٹھا کاہکشاں تک پہنچا
معلوم نہیں کس طرح ابنِ آدم
کب سرحدِ بربادیٔ جاں تک پہنچا

●

آنکھوں میں کوئی سمائے کیوں کر اے دل
غم ہائے جہاں ہیں زندگی کا حاصل
نازاں ہے صلیبِ دوراں کس پر؟
"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

○

چراغ کی لَو بڑھا بھی دو گے تو دیر تک روشنی نہ ہوگی
لہو نہیں ہے رگوں میں باقی تو معتبر زندگی نہ ہوگی

○

کس دھوپ میں ہم گھر سے چلے خیر ہو یارب
سَایہ بھی نکلتا نہیں آگے کفِ پا سے

○

اب کون دے کفن کہ گئی خوں بہا کی بات
قاتل بزعمِ خاص مرا نوحہ گر بھی ہے
جیسے کہو انیسؔ سُناؤں اسی طرح
قصّہ مرا طویل بھی ہے مختصر بھی ہے

○

سہل ہر چند راستہ نہ ہوا
عزم پابند نقشِ پا نہ ہوا
سَایہ ہمزاد بے کسی ٹھہرا
ہم سفر کوئی دوسرا نہ ہوا

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں
فریبِ آرزو ہے اور میں ہوں

○

فرازِ دار پہ اعلانِ حق کی باری ہے
گلی میں اُس کی مرا کوئی ہم سفر کیسا
جبینِ شوق تو محرابِ دل میں جھکتی ہے
حصارِ کیسے؟ غرض کیسی؟ سنگِ در کیسا؟
جنونِ سنگِ تراشی بھی ہو تو کام آئے
ہوس کے شہر میں اب کوئی شیشہ گر کیسا

○

نقابِ غنچہ نہ اُٹھتی نہ خونِ دل ہوتا
حلیفِ مہر نسیمِ سحر ہے کیا کہیے
چمن سرابِ تمنّا ہے اُس کو کیا کیجئے
سحر متاعِ فریبِ نظر ہے کیا کہیے
ہزار چہرہ درخشاں ہو رنگ و روغن سے
شعاعِ زندگی چیزے دگر ہے کیا کہیے

○

ع۔ ہم ہستی یقدرِ دل ہی تو ہے
خواب پورا ہوا، ہوا نہ ہوا

○

تمام حسنِ چمن عکسِ رنگِ خوں ہے مرا　　بہارِ حسن دکھاتی ہے کیا بہار مجھے
رقیب لاکھ کریں بدگماں مگر دل پر　　نہ اختیار ہے ان کو نہ اختیار مجھے
نگاہِ وقت سے چھپتا نہیں چراغ کوئی　　انیسؔ لاکھ وہ رکھیں پسِ غبار مجھے

○

اب وہاں کیا ہے جو جاتے ہو چمن کی جانب　　حوصلہ ہو تو چلو دار و رسن کی جانب
جانتا ہوں کہ خودی راس جب آ جائیگی　　لوگ دیکھیں گے انیسؔ آپکے فن کی جانب

○

جب بھی مستِ مئے پندار نظر آتی ہے　　زندگی اور پُر اسرار نظر آتی ہے
مہرِ تہذیب ہے شاید کہ زوال آمادہ　　دھوپ اب برسرِ دیوار نظر آتی ہے

○

چاندنی راتیں جیسی بھی ہوں سورج کی ہے بات ہی اور
سپنوں سے کب جوت جلی ہے اُجڑے ہوئے کاشانے میں

○

تلاشِ حسن میں آئے تھے سوگوار چلے　　چمن سے دامنِ دل کر کے تار تار چلے
متاعِ دیدہ و دل تھی سو وہ بھی ہار چلے　　ہوس کے شہر سے ہم صورتِ غبار چلے
ملا جواب نہ اب تک کہ زندگی کیا ہے　　فرازِ دار سے دنیا کو ہم پکار چلے

سرورق

نایاب الہ آباد

بلاک

منہاج پٹنہ ۷

ملنے کے پتے

حلقۂ احباب ، آرہ ضلع بھوجپور
"کتاب منزل" ، سبزی باغ ، پٹنہ ۴
"بک امپوریم" ، سبزی باغ ، پٹنہ ۴
"امام منزل" ، عالم گنج ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

قیمت

عام ایڈیشن	دس روپے
خاص ایڈیشن	پندرہ روپے

۱۰/